جلد ۱۱۱ | جولائی ۱۹۸۹ء | عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسّس

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۱۱ | جولائی ۱۹۸۹ء مطابق ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ | عدد ۵

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

رابطہ کے لیے: اِدارہ ترجمان القرآن، رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

فون نمبر ——— ۳۲۴۴۶۸

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

جھونکا نسیم کا تھا ، اِدھر سے اُدھر گیا

آپا نسیم آرا جو فریفتگیٔ اسلام کی وجہ سے بنت الاسلام کے نام سے زیادہ جانی گئیں ، بہ حیثیت علمبردارِ دعوتِ اسلام ، تعلیم و تعلم ، تصنیف و تالیف اور ادبِ دلپذیر کے دائروں میں بھرپور کام کر کے ۹ رجون ۱۹۸۹ء کو امتحان گاہِ دنیا سے رخصت ہو کر ان نورانی ہستیوں کی صف میں شامل ہو گئیں جن کے لیے قرآن میں وارد ہے کہ " مِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ "

جب ترقی پسند ادبی تحریک دین و اخلاق کے خلاف ایک سیلاب بن کر اٹھی تو اس سلسلے میں چار خواتین نے قلم کی ادبی قوت سے اس یلغار کے مقابلے کا عزم کیا ۔ آج اُن میں سے دو رخصت ہو چکی ہیں اور دو باقی ہیں ۔ مگر ان مجاہدات نے بہت کام کیا ۔ بنت الاسلام لاہور کالج فار ویمن میں اسلامیات کی ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھیں ۔ انھوں نے " اسوۂ حسنہ " کے علاوہ ایک دلچسپ سلسلۂ کتب بہ عنوان " زندگی بے بندگی ، شرمندگی " لکھ کر بہت مقبولیت حاصل کی ۔ انہیں صدارتی ایوارڈ بھی ملا ۔ اِسلامی نقطۂ نظر رکھنے والی خواتین کے ادبی حلقے " حریمِ ادب " کی وہ شمع بنی رہیں ۔ ماہنامہ " نور " اور " بتول " سے خاص محبت تھی ۔

میرا خیال ہے کہ وہ سچائی اور نیکی کی اتنی شمعیں کتابوں اور شاگردوں اور رفیقات کی شکل میں روشن کر گئی ہیں جو کبھی گُل نہ ہوں گی اور اُن سے پھیلنے والی روشنی اُن کے لیے صدقہ جاریہ ہو گی ۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَھَا وَارْحَمْھَا ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(فنڈامنٹل ازم پہ ایک گفتگو)

شروع شروع میں جب انگریزی تسلط کا سلسلہ چلا تو تھوڑی تھوڑی انگریزی تعلیم یافتہ کلرک، بلکہ سکولوں کے بچے ایک دوسرے کو انگریزی میں چھوٹی موٹی گالیاں دینے کی کوشش کرتے تھے۔ دراصل الفاظ تو چاہے معمولی سے ہوں جیسے ASS اور DOG وغیرہ، مگر انگریزی زبان میں ہونے کی وجہ سے چوٹ زیادہ لگتی تھی۔ اوّل تو زیر ہدف ساتھی انگریزی سے کورا ہی ہوتا اور ایک آدھ دن تو اسے پوچھنے میں لگ جاتا کہ یہ "ایس" کیا ہوتا ہے۔ اتنی بات جاننے سے پہلے وہ یونہی کہہ دیتا کہ تمہارا باپ "ایس" تمہارا دادا "ایس"، تمہارا چچا "ڈاگ"۔ آہستہ آہستہ اور زیادہ گندے الفاظ رائج ہونے لگے۔ مگر انگریزی میں ہونے کی وجہ سے چھوٹی سی گالی بڑی بھاری لگتی اور لڑکا پیچ و تاب کھاتا رہ جاتا۔ ایڈیٹ، باسٹرڈ وغیرہ تک بات عام ہونے لگی۔

انگریزی گالی کی شان ابتدائی دور میں ایسی ہوتی تھی جیسے کوئی نائی اپنی رچھانی (کسوٹ) میں سے تاگے سے لپٹے ہوئے دیسی ساخت کے استرے کے بجائے سفید یا سیاہ (مصنوعی ہاتھی دانت کے) دستے والا چمکتا ہوا چوڑا سا استرا نکالتا اور اس کا رعب چھا جاتا۔

ترقی یا فتنہ مغرب نے جہاں اور ترقیاں کیں وہاں پروپیگنڈے کے ساحرانہ حربے ایجاد کیے اور لفظوں اور اصطلاحوں کی ایسی ایسی قرولیاں بنا کر مخالفین کے پہلوؤں بلکہ دماغوں میں بھونکیں کہ زخمیوں کے زخم تاعمر مندمل نہ ہو سکے۔ چونکہ ان کے سامراجی و شہنشاہی

عزائم کا مقابلہ تمام ایشیائی مسلم ممالک میں دینی سربراہوں نے دین ہی کے دیئے ہوئے جذبہ جہاد سے کیا، لہٰذا جنگی شکست دینے کے بعد مسلم اقوام کے شکست خوردہ مجاہد ہیروز کو "ملّا" کے تحقیر آمیز دشنام سے نوازا گیا۔ جس نے خدا کا نام لیا، شریعت کی بات چھیڑی، دینی تعلیمات و اصول و حدود کے خلاف صدا بلند کی، مغرب کے سامراجی خائنین نے شور مچایا کہ دیکھو، لوگو، جانے نہ پائے، "ملّا" ہے "ملّا"۔ کہیں دوسری طرف بات پھیلی تو پھبتی کسی کہ بچو "فلاں اور فلاں سے"، یہ وہابی ہیں وہابی۔

کچھ سال بعد ہمارے ہاں مغربی سانچے میں ڈھلا ہوا جو طبقہ پیدا ہوا وہ اپنی قریبی تاریخ کو نہ جان سکا کہ کچھ لوگ عیاری اور خونخواری سے ہماری آزاد مسلم حکومتوں پر چڑھ دوڑے تھے اور ان کے خلاف جن جانبازوں نے تلوار کے میدان میں بھی اور عدالتوں میں بھی اور قلم کے میدان میں بھی مسلسل معرکہ لڑا اور انتہائی بدحالی میں گھر کر وہ اپنے اُسی مزاحمتی جذبے پر قائم ہیں کہ کسی قوت کو زور زبردستی سے اُمتِ مسلمہ پر حکم چلانے کا حق نہیں ہے، ایسے "ہیروز" کے قدموں کی خاک کو چومنے کی جگہ انگریز کے انگریز پرست شاگردوں نے اسی لفظ "ملّا" کو بلا تکلف اپنے محسنوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کیا جسے ان کے استادانِ محترم نے پاکیزگی کے جزدان سے نکال کر نفرت و تحقیر کی غلاظت میں لتھیڑا تھا۔ یعنی صیاد کے آگ دینے پر پتے بھی ہوا دینے لگے۔ سرحد پار والوں نے سوبھاش چندر داس اور بھگت سنگھ کو کیا سے کیا بنا دیا۔ اور یہاں پوری تحریکِ مجاہدین کسی "کھوہ کھاتے" میں ڈال دی گئی۔ اور کہا گیا کہ وہ تو چند سر پھرے ملّا تھے۔

ہمارے ان ماڈرنسٹوں میں اتنی خودی بھی پیدا نہ ہو سکی کہ اگر انہیں جابر سامراجی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے والے جانبازوں کو ضرور گالی ہی دینی تھی تو وہ خود کوئی گالی ایجاد کرتے۔ افسوس یہ ہے کہ انھوں نے انگریز کا اُگلا ہوا نوالہ منہ میں رکھ لیا، اور پھر وہی پارٹ ادا کیا جسے جاری رکھنے کے لیے انگریز خود یہاں باقی نہ تھا — یہ اپنے غلام سازوں کے کتنے اچھے جانشین ثابت ہوئے۔

انگریز تو پہلے مسلمانوں سے اِس بات پر چڑا کرتا تھا کہ یہ قوم اپنے عقیدۂ توحید اور

نظریہ جہاد اور کافرانہ حکومت میں مسلمانوں کا مقام اور دار الکفر اور دار الحرب جیسے مسائل چھیڑتی تھی۔ لیکن ہمارے پاکستانی انگریز اور میمیں اس بات پر چڑتی ہیں کہ ناچ گانے اور بے پردگی اور تنگ لباسی اور مخلوط مجالس کی جو غیر اسلامی تہذیب ان کو پسند آگئی ہے اس کے خلاف اسلامی نقطۂ نظر کے لوگ کیوں چیں بہ جبیں ہوتے ہیں۔ نیز وہ سیکولر جمہوریت کو کیوں اسلامی نہیں مانتے ہیں۔ ان کی موجودہ رجعت پسندانہ روش کی وجہ سے ہم ان کو ملّا کہنے پر مجبور ہیں۔

آخر ملّا کے لفظ سے جو گالی ڈھالی گئی تھی اس کا سکہ بھی گھس گھسا کر اتنا کھوٹا ہو گیا کہ اُس کا چلن ختم ہونے لگا۔ نہ خادمانِ اسلام ملّا کے لفظ سے کوئی اثر ہی نہ لیتے۔ وہ ہزار مسرت سے اس کا ہدف بنتے۔

اب کیا ہو!

اِن لوگوں نے پھر مغربی پروپیگنڈے کی ٹکسال کی طرف رُخ کیا اور کاسۂ گدائی لے کر پہنچ گئے کہ اب ہمیں سیکولرازم کے مخالف اہلِ دین کے لیے کوئی اور اچھی سی گالی درکار ہے جو کچھ مؤثر کاٹ کر سکے۔

اُدھر سے ایک نئی اصطلاح فنڈا منٹلسٹ اور فنڈا منٹلزم کی بھیک میں مل گئی۔ بھیک کیا ملی، تہذیب اور عزت اور شرف اور دانائی ایک نیا تمغہ مِل گیا۔

فنڈا منٹلزم کی سرسری تحقیق

یہ لفظ اپنے معانی میں بالکل واضح اور سادہ سا ہے۔ اصطلاحی شکل میں جا کر بھی یہ اپنی اصلیت نہیں بدلتا۔ اِس کا تعلق عیسائیت سے رہا ہے اور پھر جب مذہبی طبقے اور عقل پرستوں اور ترقی پسندوں کے درمیان کشمکش ہوئی تو یہ لفظ ایک مذہبی اصطلاح ہونے کی حیثیت سے ایک فریق کے استعمال میں آنے کے بعد تاریخی اصطلاح بن گیا۔ ایک قوم کی بدنام شدہ تاریخی اصطلاح کو اُٹھا کر آپ دوسری قوم پر بوجہ ناپسندیدگی بطور دشنام یا برائے اظہارِ نفرت یا اُسے اپنے ہاں کے تاریخی جرم کا مجرم بنانے کے لیے منطبق کرتے ہیں تو یہ کوئی

سائینٹفک منطقی یا معقول اور شریفانہ حرکت نہیں ہے۔ آپ اپنے متعلق جو چاہیں کہیں، دوسروں کو اپنی حقیقت خود تجویز کرنے دیں۔ زبردستی کسی کے سر پہ کسی غیر کی ٹوپی اُڑھانے کی کوشش نہ کریں۔

آیئے، لغت سے ابتدائی شہادت طلب کریں۔ ریڈرز ڈائجسٹ نے جو ایک جدید انگریزی لغت GREAT ENCYCLAPAEDIC DICTIONARY کے نام سے تین جلدوں میں پیش کی ہے۔ اس کی جلد ا کے ص ۳۵۳ پر ملاحظہ ہو:

FUNDAMENTAL (adj)

Of the ground work, going to the root of the matter, serving as base or foundation, essential, primary, original from which others are derived.

اسم صفت، گراؤنڈ ورک کے متعلق۔ معاملے کی جڑوں تک جانا۔ اساس یا بنا کا مقصد پورا کرنا، لازمی ہونا، مبادیاتی ہونا، ابتدائی مصدر کی حیثیت رکھنا جس سے دوسرے متضمنات اخذ کیے جا سکیں۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہیں کوئی بُری بات ہے، ہر علم کو، ہر فن کو، ہر تنظیم کو، ہر تحریک کو، ہر فلسفے، ہر دین اور مذہب کو ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے کچھ "فنڈا منٹلز" ہوں، کچھ اساسی حقائق، کچھ ابتدائی مآخذ، کچھ اٹل رہنما عقیدے اور اصول، کچھ زندہ و پائیدار اخلاقی قدریں۔

یہ چیزیں نہ ہوں تو تصویرِ حالات یہ ہو گی کہ چھت کے نیچے سے ستون نکال دیئے جائیں، دیواروں کی بنیادیں کھود دی جائیں۔ اور پھر اس مغالطے کے نتائج یُد دیکھے جائیں کہ چھت دھڑام سے نیچے آ رہے گی۔ فنڈا منٹلز کو کسی بھی نظام سے نکال دیجیے وہ کُل کا کُل ختم ہو جائے گا۔ جمہوریت سے اس کی اصولی اساسیات کو نکال دیجیے تو کھیل ختم۔

حتیٰ کہ ریاضی سے اگر جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کے طے شدہ بنیادی فارمولوں کو الگ کر دیا جائے تو سمجھیے کہ ساری ریاضی ختم۔ مثلاً آپ اگر طے کرتے ہیں کہ ۲ اور ۲ مل کر ۴ کے بجائے ۶ ہوں گے، یا ۱۰ میں سے ۳ کم کرنے سے بقایا ۱۱ رہ جائیں گے یا ۴ کو ۶ سے ضرب دینے سے ۲۱ بنیں گے۔ اور ۲۸ کو ۹ پر تقسیم کرنے سے ۲ جواب آئے گا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ریاضی کا ایک کلیہ دوسرے کو ختم کر دے گا۔ اور جن ہندسوں سے جو بھی جواب آپ کسی عمل سے برآمد کرنا چاہیں گے، برآمد کر لیں گے۔ اگر ہر کسی کو اپنی مرضی سے رقمیں طے کرنی ہوں تو لین دین کے نرخ اور حساب کتاب اور بی کام جیسے علوم وغیرہ کا صفایا ہو جائے گا۔ بلکہ لین دین کا تمام سماجی عمل ختم ہو جائے گا۔

پس فنڈا منٹلز کا حق ہے کہ ان کی حفاظت کی جائے۔ اور حفاظت کرنے والے کو اگر فنڈا منٹلسٹ کہا جاتا ہے تو یہ عزت افزائی کی بات ہے اور ایسا کہلوانا اس کا استحقاق ہے۔

متذکرہ انسائیکلوپیڈیا ئی ڈکشنری کے مطالعہ کو ہم ذرا اور آگے بڑھاتے ہیں:۔

FUNDAMENTAL
FUNDAMENTALITY } ns

Principal, rule, article serving as ground-work of system.

FUNDAMENTALISM (usually plural)

Strict adherence to traditional Orthodox (Protestant) tenets (e.g. the literal inerrency of Scripture), held to be Fundamental Christianity; adherence to traditional beliefs of any kind.

(۱)

فنڈا منٹل ـــ فنڈا مینٹیبلیٹی ۔ (NS)

(معانی): اُصول، قاعدہ اور ضابطہ جو کسی بھی نظامِ کار کے لیے اساسیات کا مقصد پورا کریں۔

(۲)

فنڈا منٹلزم (بالعموم بصورت جمع استعمال ہوتا ہے)

اِس کے معنی ہیں: روایتی آرتھوڈکس (پروٹسٹنٹ) عقیدوں سے شدید وابستگی (یعنی مقدس نوشتوں کا لفظ لفظ میں منزہ عن الخطا ہونا) کے تصور پر مبنی ہے۔ بنیاد پرستانہ مسیحیت۔ نیز مراد ہے کسی بھی طرح کے بنیادی تصورات سے وابستگی رکھنا۔

یہاں تک تو بات لغت کے دیے ہوئے مفہوم کی ہو رہی تھی اور اس گفتگو میں ابھی کوئی خطرناک عنصر داخل نہیں ہوا۔ لیکن متعلقہ الفاظ و اصطلاحات جب تاریخ کے خراد پر چڑھ جاتے ہیں تو نئی ہیئت اختیار کر کے ہیئت اصلیہ کھو دیتے ہیں۔ آیئے تاریخی خراد کے عمل کو دیکھنے کے لیے بیسویں صدی کے اوائل میں چلیں۔ اتفاق سے پرانے تصادموں اور معرکوں کی روئیدادیں تلاش کرنے میں مجھے ایک پرانی انسائیکلوپیڈیا (EVERY MAN'S ENCYCLPAEDIA) بڑی مدد دیتی ہے۔ جسے ایم ڈینٹ اینڈ سنز لمیٹڈ نے اسے برطانیہ سے شائع کیا۔ کاپی رائٹ ۳۲-۱۹۳۱ء۔ لیجیے ان اوراق سے قصۂ پارینہ سنیے:

فنڈا منٹلزم کا خلاصۂ مدعا وہ مخالفت و مزاحمت ہے جو سرمستانِ اعتقاد اربابِ کلیسا کی طرف سے جدید سائنس کی تعلیم کے ایسے پہلوؤں سے متعلق تھی جو بائیبل کی مقدس روایات سے متصادم ہوتے تھے۔

فنڈا منٹلزم کی لہر یو ایس اے میں غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی خصوصیت سے جنگِ عظیم (اوّل) کے بعد۔ یہ قضیۂ گویا اُس وقت آخری حد تک پہنچا دیا گیا جب ڈاکٹر ہیری ایمرسن فاسڈک (HERRY EMERSON —— FOSDICK)

کو نیویارک کے اوّلیں پریسبائی ٹیرین چرچ کی طرف سے ۱۹۲۲ء میں بلایا گیا
اور اس نے اپنے "سرمن" (مذہبی یا کلیسائی لکچر) میں خطاب کرتے ہوئے
اہلِ روایت کے مذہبی طرزِ فکر کو ہدف بنایا۔ بس یہ واقعہ بحث و تمحیص کے عام پھیلاؤ
کا ذریعہ بن گیا، جس کے اثرات بھی ۱۹۲۳ء میں آخری حد کو جا پہنچے، جب کہ
پریسبائی ٹیرین چرچ کی جنرل اسمبلی نے اپنے ۱۹۱۰ء کے نظریات و عقاید
پر پورے زور سے یقین و اذعان کا اظہار کیا۔ اس اسمبلی نے بطور امرِ واقعہ یہ
تصور بحال کر دیا کہ پریسبائی ٹیرین مذہب کے منشا کے مطابق کوئی بھی شخص
جو عین لفظی صورت میں (یعنی لفظوں کے سادہ ظاہری مفہوم کو قائم رکھتے ہوئے)
بن باپ کے واقعۂ پیدائش (عیسائیوں کی اصطلاح (VIRGIN BIRTH)
کی ہے۔ مگر اس کا ترجمہ اگر کنواری ماں کیا جائے تو اس میں ایک معنیٔ سُو بھی پیدا
ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے قرآن کی مدد سے ترجمہ بدل دیا)۔ یسوع (مسیح علیہ السلام)
کے دوبارہ زندہ ہونے، نوشتوں کے منزہ عن الخطا ہونے، روحانی نجات
کے عقیدے، اور معجزوں میں یقین رکھنے کے اصولیات کو نہ مانے وہ عیسائی نہیں
ہو سکتا۔ مگر فنڈا منٹلزم یو ایس اے میں اُس وقت پوری قوم کی توجہات کا
مرکز بن گیا، جب ایک نوجوان سکول ٹیچر (JOHN T. SCOPES) کو اس
الزام میں عدالت میں لا کھڑا کیا گیا کہ اُس نے ریاست ٹینیسی (TENNESSEE)
کے ان قوانین کی خلاف ورزی کی جو ریاست کے پبلک سکولوں میں نظریۂ ارتقا
کی تعلیم و تدریس کی ممانعت کے لیے تھے۔ سکوپ ریاست کے مقام ڈیٹن
(DAYTON) میں ہائی اسکول کا معلم تھا۔ ولیم جیننگز برائیان WILLIUM
JENNIGS BRYAN جو تین بار امریکی انتخاباتِ صدارت میں حصہ لے
چکا تھا۔ متذکرہ مقدمے میں حصہ لینے کے لیے ڈیٹن آیا۔ کلیئرنس ایف ڈارو
(CLARENCE F. DARROW) بڑے پائے کا وکیل اور مشہور
آزاد خیال آدمی (FREE THINKER) تھا، ملزم کا وکیلِ دفاع بنا۔

دائرۂ صحافت کے لوگ تمام ملک سے انبوہ در انبوہ جمع ہونے لگے۔ فوری نکتۂ نزاع محض ایک ریاست کے قانون کی خلاف ورزی تھا۔ لیکن اپنے وسیع متضمنات SERIOUS IMPLICATIONS کے لحاظ سے یہ مقدمہ اپنی لپیٹ میں اس نازک سوال کو لیے ہوئے تھا کہ آیا کوئی ریاست اپنی مقننہ کے ذریعے کسی سائنسی تعلیم کو مذہبی عقیدوں سے ٹکرانے کی بنا پر روک سکتی ہے۔ امریکہ کے بے حیثیت صحافیوں نے اس مقدمہ کو "بندر کیس" (THE MONCKEY TRIAL)[ل] کا نام دیا۔ برائیاں نے حلفیہ بیان کے ساتھ استدلال کیا کہ بائیبل کا ہر لفظ اور ہر فقرہ عین اپنی لفظی و ظاہری شکل میں سچائی پر مبنی ہے۔ اس نے نظریۂ ارتقا کی مخالفت کی، کیونکہ وہ بائیبل کے بیان کردہ قصۂ تخلیق کے خلاف جاتا تھا۔

جیوری نے قاعدے قرینے سے سکوپس (سکول ٹیچر) کے خلاف فیصلہ دے دیا اور اس پر ایک سو ڈالر جرمانہ کیا گیا۔ بعد میں ریاست کی بالا ترین عدالت نے محض ایک ٹیکنیکل پوائنٹ کی بنا پر فیصلہ اُلٹ دیا۔ اِس پر ریاست ٹینیسی نے پھر متعلقہ پوائنٹ پہ قانون سازی کر لی۔ بعد میں فنڈا منٹلی نقطۂ نظر رکھنے عیسائیوں نے سات آٹھ اور ریاستوں میں بھی (بائیبل کی صداقت کے تحفظ کے لیے) ویسے ہی قوانین پاس کرا لیے۔ لیکن اُن کی سرگرمیاں طنز و مزاح

ل روایتی کہاوت کے مطابق دو بلیوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا جج بندر مقرر ہوا اسی کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرا اشارہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ڈارون ازم بندر والا فلسفہ کے نام سے مشہور رہا۔ اب بھی نظریۂ ارتقا کا خلاصہ ہمارے ہاں یہی معروف ہے کہ انسان بندروں سے پیدا ہوا۔ (گو یہ بات ذرا سی نادرست ہے)۔ اسی کی بنیاد پر اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا کہ:

کہا منصور نے خدا ہوں میں — ڈارون بولا بوزنا ہوں میں
سُن کے کہنے لگے میرے اک دوست — فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

کی نذر ہوگئیں۔

پھر ہر طرف کلیساؤں میں بھی اور معاشرے میں بھی آزادی پسند عوام اور عقیدہ پسند پادریوں کے درمیان نزاع چل پڑی۔ جوں جوں سائنس، فلسفے اور تعقل کے قدم آگے بڑھتے اور دنیوی لذات و تفریحات کی ہوس نے انسانوں میں خدا و آخرت کے خوف سے آزاد ہو کر زندگی کے حیوانی عنصر کو زیادہ اہمیت دی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کی طرف سے زیادہ سے زیادہ قوت دور ہو کر لامذہبیت کی راہ پر آگئی۔ اس کشمکش میں عیسائیوں کے مذہبی کارفرماؤں کو کبھی یہ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا کہ اُن کے قضیے (CASE) میں کمزوریاں کیا ہیں۔

بہر حال کٹر عیسائیوں کے لیے اظہار نفرت کا ذریعہ سائنس پرستوں اور عقل پرستوں اور خواہش پرستوں نے یہ اختیار کیا کہ وہ انہیں "فنڈامنٹلسٹ" کہیں اور ان کے بارے میں یہ اثر پیدا کریں کہ اُن کے طرزِ فکر پر ترقی کرتی ہوئی زندگی استوار نہیں ہو سکتی۔

اِسلام کا معاملہ مختلف ہے

متذکرہ تاریخی سلسلۂ واقعات میں جو کچھ سامنے آیا ہے اس کا کوئی پہلو اسلام پر منطبق نہیں ہوتا۔

اوّلاً: بائیبل لفظ بہ لفظ الہامی کتاب نہیں ہے جسے خدا کی طرف سے کسی خاص منتخب بندے پر نازل کیا گیا ہو، بلکہ اس کی تو تاریخی حیثیت ہی سرے سے نہیں ہے۔ کتاب کس نے لکھی ہے، کب لکھی، کتنی کس مرحلے میں لکھی گئی، کتنی کس مرحلے میں، کتنا حصہ متن ہے اور کتنا اس کی تشریح و تاویل، اور کیا باتیں پادریوں یا ان کی مذہبی کمیٹیوں نے درج کیں۔ اور کہاں کہاں ترامیم ہوئیں۔

یہ کسی تاریخی معیار سے ثابت نہیں ہے کہ الواحِ طُور پر سے کس کس نے تورات کے عقیدے اور احکام کب کب یاد کیے یا لکھے یا کب کب وہ پڑھے گئے یا ایک شخص سے دوسرے تک کیسے راویوں کے ذریعے منتقل ہوئے۔

پھر اسے الہامی کتاب کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ بخلاف اس کے قرآن نجماً نجماً جس طرح نازل ہوا اُسی طرح وہ یاد بھی کر لیا گیا، لکھا بھی گیا، نمازوں میں بھی پڑھ پڑھ کر سُنایا جاتا رہا، وعظوں اور خطبوں کی صورت میں اس کی آیات کے حوالے دیئے گئے، مدرسوں میں بھی تعلیمِ قرآن اور حفظِ قرآن کو لازم کیا گیا۔

ثانیاً اسلام میں ایک ہی حقیقتِ عظمیٰ ہے کہ خدائے واحد موجود ہے اور وہی کائنات کے نظام کو اپنے نوامیس کے تحت چلا رہا ہے اور وہی انسانوں کو ایسے عقیدوں اور عبادات اور اخلاقیات اور قوانین سے اپنے انبیاء کے ذریعے الہامی طریق سے آگاہ کرتا ہے جن میں دُنیا کی بھی فلاح ہے اور آخرت کی بھی کامرانی۔ فرد کے لیے سلامتی ہے اور اجتماعیت کے لیے بھی استحکام۔ معاشرے کے لیے عدل، امن، مواخات اور مساوات کی برکات ہیں۔

اس خدا نے اپنی الہامی کتاب میں ماضی کا کوئی مختصر ٹائم ٹیبل نہیں دیا ہے کہ آدمؑ کے ظہور سے لے کر اب تک کی تاریخ چند ہزار سال میں بن گئی۔ بلکہ قرآن سے یہی تصور ملتا ہے کہ سلسلۂ تخلیقِ کائنات و تزئینِ کائنات (مع زمین) کئی لمبے ادوار میں مکمل ہوا ہے۔

قرآن کا بیان یقیناً آدم علیہ السلام کے متعلق ایسا ہے کہ وہ پہلے انسان تھے، ایک ممتاز و مقبول فرد تھے، اُن کو حصولِ علم کے ذرائع دے کر زمین میں منصبِ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے چُن لیا گیا۔[1] اِس سلسلہ میں ہم نظریہ ارتقا پر بعد میں گفتگو کریں گے۔

---

[1] ہمارے یہاں کے بعض علماء جو مروجہ نظریہ ارتقا سے متاثر ہیں، وہ بالعموم تاویل کی یہ راہ نکالتے ہیں کہ بدنی یا عضویاتی (BIOLOGICAL EROLUTION) کی بحث میں ہم پڑتے ہی نہیں، ہم یہ کہتے ہیں کہ پہلا انسان وہ تھا جس کے اندر سب (باقی بر صفحہ آئندہ)

دوست ہو یا دشمن اسلام کے تصوّرِ الٰہ اور تصوّرِ توحید اور تصوّرِ وحی و رسالت پر غور کرے تو ان تصوّرات کے تحت کائنات اور اس کے ریاضیاتی نظام اور اس کے اٹل نوامیس اور اس کے مظاہر جمالیات کی بہترین تعبیر ممکن ہو جاتی ہے اور آدمی کا دل بنیادی حقیقت کے متعلق سرمایۂ یقین سے مالا مال ہو کر زندگی میں اپنا بہترین مثبت اور تعمیری حصہ ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اسلام، انسان کو اخلاقی شعور دیتا ہے اور اس کی روشنی سے وہ تمام بین الانسانی اخلاقی قدریں روشن ہو جاتی ہیں جن کی تعلیم ہر پیغمبر کے ہاں ملتی ہے اور جس کی تعلیم سے ہر گوشۂ ارض منور ہے۔

اسلام انسان کے لیے اسی طرح حدود اللہ کو معین کرتا ہے جیسے ٹریفک سگنلز اور سائنز سڑکوں پر لگے ہوتے ہیں۔ مراد یہ ہوتی ہے کہ ان حدود کو چھوڑ دو گے تو حادثات نمودار ہوں گے۔ اچھے لوگ ان حدود کا احترام اوّل تو اس ایمان سے کرتے ہیں کہ یہ خدا اور رسولؐ کی مقرر کردہ ہیں۔ کچھ اچھے لوگ ایمان و اعتقاد کے علاوہ ان حدود کو عقلی پہلوؤں سے جانچ کر اور ان کے نتائج کا جائزہ لے کر بھی انہیں ناگزیر پاتے ہیں۔ کچھ کمزور مزاج کے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) سے پہلے نیکی بدی کے شعور کا شرارہ روشن ہوا۔ جیسے اللہ نے وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ۔ کہہ کر بیان کیا ہے۔ رُوح کے معنی مجرد زندگی نہیں، بلکہ نیکی بدی کے شعور و احساس کا نام ہے۔ ایک اخلاقی حس یا باقی حیوانات میں مرغوب و نامرغوب اور مطلوب و نامطلوب کے رجحانات کام کرتے ہیں جن میں جبلت رہنمائی کرتی ہے۔ لیکن نیکی (جو ظاہراً یا وقتی طور پر وجہِ تکلیف ہو سکتی ہے) اور بدی (جو ظاہراً لذت بخش اور وقتی طور پر بے ضرر معلوم ہوتی ہے) کا اخلاقی امتیاز کرنا، اور بدی سے پرہیز کرتے ہوئے نیکی کی پابندی کرنا اور اس مسلک کے لیے مسلسل قربانیاں دینا، یہ صرف انسان میں پایا جاتا ہے۔ اس بارے میں اس کا کوئی رابطہ حیوانات سے نہیں بنتا۔ آپ ہزار جبڑوں اور کولہوں کی ہڈیوں اور پسلیوں میں مشابہتیں تلاش کریں، اخلاقی شعور کی کوئی مشابہت حیوانات اور انسان میں نہیں ہے۔ یہی وہ دیوار ہے جو دونوں اقسامِ موجودات کو الگ کرتی ہے۔

ضعیف، سا ایمان بھی ہوتا، جو عقلی طور پر بھی اچھائی بُرائی کو تسلیم کرتے ہیں مگر خواہشاتِ نفس کا دباؤ ان پر زیادہ ہوتا ہے۔ اُن کے لیے دو چیزیں مدد ہوتی ہیں: ایک معاشرے (اگر وہ صحت مند ہو) کی رائے عام کا دباؤ، دوسرے وعظ نصیحت، درس و تدریس، اجتماعات، اچھا لٹریچر، اچھی صحبت اور اچھے حلقہ ہائے اعزہ و احباب۔ نیز معاشرے میں بُرائی کے لیے اُکسانے والے محرکات و عوامل سے ان کا تحفظ۔ آخر میں انسانوں کی وہ قسم آتی ہے، جو اسلام میں داخل ہونے کے بعد بھی ذہنی بگاڑ کی وجہ سے اپنے عقیدوں، اخلاقیات اور قانونی حدود کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ ایسے لوگوں کی منزل عدالت کا کٹہرا ہے۔

یہ سارا نظام اور اس کا ہر شعبہ اتنا منظم اور اتنا عقلی ہے کہ دورِ رحمت اور دورِ خلفائے راشدین کے معیاری زمانوں میں اس کے خلاف عقلی اجماع پیدا نہیں ہوا۔ بعد کے دور نے جدید ترین آلات و ایجادات سے کام لیا اور خود مسلمانوں نے بڑی جنگی مشینیں تیار کیں۔ دوسری زبانوں کو سیکھا گیا۔ بعد کے بادشاہی ادوار میں جب کہ اسلامی نظام کا پورا ڈھانچہ موجود نہیں رہا، بلکہ اس میں طرح طرح کے خلل اور رخنے پیدا کر دیئے گئے، ہر قسم کی طبی اور علمِ فلکیات کی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ بیرونی فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات بھی زیر بحث رہے۔ صنعتوں میں بھی ہر جہتی ترقی ہوئی۔ فنِ تعمیر، فنِ خطاطی اور رنگکاری اور شعری اور نثری ادب میں بھی ترقی جاری رہی۔ سمندروں پر قابو پانے کے لیے چھوٹی کشتیوں سے لے کر بڑے جہاز تک بنائے گئے، دُنیا کے نقشے اور بحری نقشے تیار کئے گئے۔ لیکن اس ترقی کے خلاف اہلِ تدین و تقویٰ نے کبھی کوئی تصادم پیدا نہیں کیا۔ تصادم پیدا ہوا تو صرف اس بات پر کہ بادشاہی نظام اسلام کے نظامِ عدل و امن کے خلاف ہے، تصادم اس پر کہ بادشاہوں کو اپنی عیاشیوں پر قومی خزانے کا مال صرف کرنے کا حق نہیں ہے، تصادم اس پر کہ بادشاہت اور درباریوں کو شراب اور قمار اور رقص و سرود میں مخمور رہنے اور معاشرے میں اسے پھیلانے کا حق نہیں۔

(باقی)

اُستاذُ العلماء — مولانا محمد چراغ کی یاد میں

جناب پروفیسر محمد اسلم اعوان

برصغیر پاکستان و ہند میں، فکرِ اسلامی اور احیائے اسلام کی تحریکوں کا جائزہ لیا جائے تو ایک حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اسلامیانِ ہند کے بارہ سو سالہ عہدِ اقتدار (۷۱۲ — ۱۸۵۷ء) میں چند ایک مستثنیات کو چھوڑ کر نظامِ حکومت اور معاشرہ کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے کسی سنجیدہ اور مستقل سلسلۂ مساعی کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے — اور آخر کار وہ وقت بھی آیا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اسلامیانِ پاکستان و ہند مایوسی کی انتہاہ گہرائیوں میں گرتے گئے حتیٰ کہ ڈاکٹر اقبال جیسا رجائیت پسند اور نابغۂ روزگار شخص بھی اِس حقیقت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

> "پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے اور اگر خدائے تعالیٰ نے کوئی خاص مدد نہ کی تو آئندہ بیس سال بڑے خطرناک نظر آتے ہیں۔ صوفیاء کی دکانیں ہیں، مگر وہاں سیرتِ اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔ کئی صدیوں سے علماء اور صوفیا میں طاقت کے لیے جنگ رہی، جس میں آخر کار صوفیا غالب آئے یہاں تک کہ اب برائے نام علماء جو باقی ہیں — وہ بھی جب تک کسی نہ کسی خانوادے میں بیعت نہ لیتے ہوں، ہر دلعزیز نہیں ہو سکتے۔ یہ روش گویا علما کی طرف سے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ مجدد الف ثانی، عالمگیر اور مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہم نے اسلامی سیرت کے احیا کی کوشش کی مگر صوفیاء کی کثرت اور

صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اس گروہِ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اب اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسہ ہے۔ میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں؟ صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں۔ ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان، جو ذوقِ خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو، مل جائے۔ جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں......"

مکتوب بنام اکبر الہ آبادی مرقومہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء

بحوالہ اقبال نامہ جلد ۲ ص ۷۴ تا ۴۹)

ڈاکٹر اقبال ذوقِ خداداد اور قوتِ عمل رکھنے والے جس نوجوان کی تلاش میں تھے، اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے، برصغیر پاکستان و ہند میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جانِ پرسوز رکھنے والا وہ نوجوان سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ — ۱۹۷۹ء) کی صورت میں سامنے آیا۔ جس کی تفصیل مشہور بزرگ صحافی اور برصغیر میں برپا ہونے والی تمام تحریکوں کے عینی شاہد میاں محمد شفیع (المعروف م ۔ش) کی نگارشات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق میاں صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"میں سو فی صدی ذمہ داری سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ علامہ نے مولانا مودودیؒ کو ایک خط کے ذریعے حیدر آباد (دکن) کے بجائے پنجاب کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کی دعوت دی تھی بلکہ وہ خط انھوں نے مجھ سے ہی لکھوایا تھا"

(بحوالہ لاہور کی ڈائری ہفت روزہ "اقدام" لاہور ۹ جون ۱۹۶۳ء

مولانا مودودیؒ کی ذات اور خدمات محتاجِ تعارف نہیں۔ برسبیل تذکرہ یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ جماعتِ اسلامی کے قیام کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام یک زبان ہو کر اس تحریک کے دست و بازو بن جاتے لیکن شومئی قسمت سے علماء کی اکثریت نہ صرف جماعت سے گریزاں رہی بلکہ باقاعدہ محاذ آرائی

کے ذریعے اپنی قوتوں کے بے پایاں ضیاع کا سبب بنی - چنانچہ متحدہ کانگریس اور اشتراکیت کے حامی اس میں نمایاں رہے ـــ اور اس کا سب سے بڑا سبب وہ حزبی تعصب، گروہی پاسداری اور دیگر وہ عوامل تھے، جن کا ذکر ڈاکٹر اقبال رحؒ نے اپنے مکتوب میں کیا تھا۔

اِن حالات میں طبقۂ علماء میں سے ایک ایسی شخصیت سامنے آئی جس نے مسلک وغیرہ کی طرف داری سے ہٹ کر، اور علانیہ طور پر شرحِ صدر کے ساتھ عہدِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق دین کی خدمت کے لیے جماعتِ اسلامی کا ساتھ دیا۔ یہ شخصیت انور شاہ کاشمیری کے شاگردِ خاص مولانا محمد چراغ کی تھی، جو ۴ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۱ را پریل ۱۹۸۹ء کو پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، افغانستان، ماریشس اور پوری دنیا میں پھیلے ہوئے اپنے ہزاروں شاگردوں اور نیازمندوں کو سوگوار چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

يَآ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ٥ ارْجِعِيٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ٥ فَادْخُلِي فِي عِبٰدِي ٥ وَادْخُلِي جَنَّتِي ٥

ترجمہ: ”نفسِ مطمئن! چل اپنے رب کی طرف، اِس حال میں کہ تو (اپنے انجامِ نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنّت میں۔“

مولانا محمد چراغ ۴ رجمادی الاول ۱۳۱۴ھ (مطابق ۱۸۹۴ء) کو موضع دھکڑ ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی کا نام حافظ کرم دین تھا۔ ابتدائی عربی تعلیم نزدیکی گاؤں موضع گنجہ میں مولانا سلطان محمود صاحب کے مدرسے میں حاصل کی، جو دیوبند کے سابق فاضل اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن (اسیر مالٹا) کے شاگردوں میں سے

تھے۔ ان کے بعد موضع آنی ضلع گجرات میں مولانا ولی اللہ[1] سے کسب فیض کیا۔ مولانا ولی اللہ کا تعلق کسانوں کے ایک خوشحال خاندان سے تھا۔ چنانچہ وہ اپنے تمام طلبا اور شاگردوں کو اپنے گھر سے کھانا اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرتے اور ان کے مدرسے کے طلبہ کو عام اجازت تھی کہ ان کی وسیع و عریض زمینوں سے گنّے توڑیں اور دیگر موسمی سبزیات اور ترکاریات سے جب چاہیں لطف اندوز ہوں ـــــ اور مولانا کے علمی تبحّر کا یہ عالم تھا کہ متداول کتابوں میں جس کتاب کے مشکل ہونے کے سبب دیگر مدرسوں کے ارباب، عذر کا اظہار کرتے، وہ کتاب موضع آنی میں ـــــ مولانا ولی اللہ (وفات ۱۹۷۳ء) کے مدرسے میں پڑھائی جاتی ـــــ موضع آنی کے مہتمم مدرسہ اپنے استاذ گرامی کے حکم کے مطابق علمی بساط بچھانے کے لیے اس مقام کو چھوڑ کر موضع ونده شاہ بلاول ضلع کیمل پور گئے تو کم سن شاگرد محمد چراغ بھی اس عالمی مرتبت استاد کے ہمراہ تھے۔ مختلف مقامات پر تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور میں اپنے بڑے بھائی مولانا محمد سراج صاحب کے پاس چار سالہ قیام کے دوران مدرسہ جامعہ نعمانیہ اچھرہ لاہور میں حصولِ علم کے ساتھ ساتھ محقق خطاطی اور خوش نویسی سیکھی ـــــ انھی دنوں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور اور دیوبند کی علمی بہاروں کے چرچے سن کر مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور پہنچے اور مولانا محمد الیاس صاحب بانی تبلیغی جماعت سے فقہ کی مشہور کتاب "کنز الدقائق" پڑھی اور ان کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوئے۔ تکمیل کے لیے دیوبند میں داخل ہوئے اور مولانا انور شاہ کاشمیری سے فیض علمی حاصل کیا۔ چنانچہ شاہ صاحب موصوف سے ترمذی شریف، میاں اصغر حسین سے ابوداؤد، مفتی عزیز الرحمٰن سے طحاوی اور مولانا اعزاز علی صاحب سے ادبِ عربی کی کتب حماسہ، متنبّی اور مقامات وغیرہ پڑھیں۔ لیکن خصوصی کسبِ فیض علامہ انور شاہ کاشمیریؒ سے

[1] مولانا ولی اللہ صاحب کی صحیح وفات ۱۹۷۳ء ہے جو ابتداءً میں سہواً نہیں لکھ سکا ہوں۔ چنانچہ مضمون کی اشاعت کی صورت میں مولانا کے اوّلین تذکرہ کے ساتھ اس کی اشاعت ہو جائے۔

ہی کیا۔ اور آپ کے خاص الخاص شاگردوں کی صف میں جگہ پانے کا اندازہ اس ایک درج ذیل واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت انور شاہؒ ترمذی شریف پڑھاتے وقت اپنے تلامذہ کے سامنے اس کی شرح اُردو زبان میں کرتے۔ لیکن متعلم محمد چراغ کے عربی زبان و ادب پر ماہرانہ عبور اور زود نویسی و خوش نویسی کا یہ عالم تھا کہ آپ استاد کی اُردو تقریر و شرح کو سن کر اُسی وقت اپنے طور پر عربی زبان میں ترجمہ کر کے اپنی نوٹ بک پر منتقل کرتے جاتے۔ اور ہو بہو حضرت شاہ صاحب کی تقریر انتہائی نفاست اور خوش نویسی کے ساتھ مکمل محفوظ کر لی۔ چنانچہ دورۂ حدیث کے اختتام پر جب اُستاد نے طلبا کے نوٹس (NOTES) کی کاپیاں ملاحظہ کیں تو تمام طلبا نے آپ کی تقریر کو اُردو زبان میں لکھا ہوا تھا، لیکن مولانا محمد چراغ کی تحریر کردہ شرح و تقریر ہو بہو نفاست سے لکھی ہوئی مکمل عربی زبان دیکھی تو ایسے لائق و فائق شاگرد پر رشک کرتے ہوئے فرمایا ـــ" کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میری شرح و تقریر کو اس مکمل انداز میں لکھنے والا کوئی ایسا طالب علم بھی موجود ہے تو میں اپنی تقریر کو اور بھی طویل کر دیتا ـــ" چنانچہ یہ شرح " العرف الشذی " کے نام سے معروف ہوئی۔

دورۂ حدیث کے اختتام کے قریب ایک عراقی شیخ عبدالغفور موصلی نے آپ سے بخاری و ترمذی کی کاپی دیکھی تو بخاری کی کاپی نقل کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے ازراہِ دلداری تقریر نقل کر دی۔ آپ دورۂ حدیث کے بعد گھر واپس آ گئے۔ سالانہ تعطیلات میں اتفاقاً شیخ موصلی سے حضرت شاہ صاحب نے تقریر بخاری دیکھی تو انہوں نے کہا کہ یہ شیخ سراج فنجابی (شیخ چراغ پنجابی) سے نقل کروائی ہے۔ اس پر حضرت شاہ صاحب متاثر ہوئے اور فرمایا " اچھا میں تو نہیں سمجھتا تھا کہ اس زمانے میں بھی کچھ لوگ ذی سواد ہوتے ہیں"۔ انہی دنوں مولانا مظفر جہلمی کی وساطت سے شاہ صاحب نے آپ کو گاؤں سے دیو بند واپس بلوایا اور ترمذی کی پوری تقریر نوٹ کروائی۔ آپ نے دو نسخے تحریر کیے ایک حضرت شاہ صاحب کے لیے اور دوسرا اپنے لیے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے نسخے میں کچھ حک و اضافہ فرمایا، جو بعد میں دوسرے ایڈیشن میں شاملِ اشاعت کر لیا گیا۔

مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے علوم و معارف کے بے پایاں ہونے کا اندازہ اس حقیقت سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ایک زمانے میں ۱۹۱۱ء کے لگ بھگ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کی یہ کیفیت تھی کہ آپ قادیانیت کے بارے میں اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے چنانچہ اقبالؒ جیسے نابغہ روزگار شخص کو قادیانیت کی گمراہی کی دلدل سے نکالنے والی ذات مولانا انور شاہ کاشمیری کی تھی۔ جنہوں نے اپنے بے پایاں علم سے اقبالؒ کو ضائع ہونے سے بچا لیا ــــ اور میں سمجھتا ہوں کہ جب تک استاد کا تذکرہ نہ کیا جائے شاگرد کے رجحانِ طبع کا اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے ــــ یہاں مزید گنجائش تو نہیں البتہ انور شاہ کاشمیری کی انصاف پسندی اور مسلکِ اعتدال کا اندازہ لگانے کے لیے ایک واقعہ ہی کافی ہے جو اُن کے ایک شاگرد کی زبانی سنیے کہ " قادیان میں مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر پر مشتمل ہمارا ایک جلسہ ہر سال ہوا کرتا تھا اور مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس جلسہ میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اِس جلسہ میں تشریف لائے، میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نمازِ فجر کے وقت اندھیرے میں داخل ہوا کہ حضرت سر پکڑے مغموم بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا حضرت کیسا مزاج ہے؟ کہا ہاں ٹھیک ہی ہے۔ میاں مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کر دی۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گزری ہے۔ ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمتِ دین میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی۔ فرمایا میں تمہیں صحیح کہتا ہوں کہ عمر ضائع کر دی۔ میں نے عرض کیا، حضرت بات کیا ہے؟ فرمایا ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کدو کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح کو ثابت کر دیں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کاوشوں کا، تقریروں کا، علمی زندگی کا۔ اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابو حنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں، اُن کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے، وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا

وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔ اور امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسالک کے فقہاء، جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں کیا حاصل ہے اس کا؟ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو صواب متحمل الخطا یا درست مسلک جس میں غلطی کا احتمال موجود ہے ثابت کریں اور دوسرے مسلک کو خطا متحمل الصواب (غلط مسلک جس میں حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں، اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں۔ ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطا۔۔۔ اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں بھی تمام تر تحقیقات و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے اور وہ بھی صحیح ہے۔۔۔ یا یہ کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ غلط ہو اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو، دنیا میں تو یہ ہے، قبر میں منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا؟ آمین بالجہر حق تھی یا آمین بالسر حق تھی، برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ اور قبر میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں ہوگا۔ حضرت شاہ صاحب کے الفاظ یہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نہ شافعیؒ کو رسوا کرے گا، نہ ابو حنیفہؒ کو، نہ مالکؒ کو، نہ احمدؒ بن حنبل کو جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے، جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے جنہوں نے ہدایت کا نور چار سو پھیلایا۔ جن کی زندگیاں ہدایت کا نور پھیلانے میں گذریں۔۔۔ اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدانِ حشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابو حنیفہؒ نے صحیح کہا تھا یا شافعیؒ نے غلط کہا تھا۔ یا اس کے برعکس نہیں ہوگا۔ تو جس چیز کو نہ دنیا میں کہیں نکھرنا ہے نہ برزخ میں، نہ محشر میں۔ اس کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی۔ اپنی قوت صرف کر دی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی۔ مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیا کرام لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی۔ آج یہ دعوت نہیں دی جا رہی ہے۔

بہ ضروریاتِ دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے و اغیار ان کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں۔ اور منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے رہنا چاہیئے تھا، وہ پھیل رہے ہیں، گمراہی پھیل رہی ہے، الحاد آ رہا ہے، شرک و بت پرستی چل رہی ہے۔ حرام و حلال کا امتیاز اُٹھ رہا ہے، لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فروعی بحثوں میں۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی ...... الخ

چنانچہ بلا خوفِ تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اِس شہرہ آفاق اُستاد کی انصاف طبعی، معتدل مسلک اور متوازن کو، حضرت کے ہزاروں شاگردوں میں سے اگر کسی نے صحیح معنوں میں حرزِ جاں بنایا تو وہ مولانا محمد چراغؒ ہی تھے، جس کا تذکرہ آگے آئے گا۔
دیوبند سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ اپنے اُستاد گرامی کے حکم پر میرٹھ تشریف لے گئے۔ جہاں کے مدرسہ کے اربابِ حل و عقد کی جانب سے ایک لائق اُستاد کی طلب پر حضرت شاہ صاحب نے آپ کا انتخاب کیا۔ وہاں آپ نے ایک سال تدریس کا کام کیا۔ میرٹھ سے۔ واپسی پر لاہور جامعہ فتحیہ اچھرہ میں کچھ عرصہ کام کیا۔۔ سیّد جماعت علی شاہؒ (۱۸۴۵ء ــــ ۱۹۵۱ء) علی پور سیداں ضلع سیالکوٹ نے باوجود اختلافِ مسلک کے آپ کے تبحرّ علمی سے متاثر ہوکر اپنے صاحبزادے پیر محمد حسین کی تعلیم کے لیے آپ کو انتہائی ادب و احترام سے علی پور سیداں ضلع سیالکوٹ میں مدعو کیا۔ چنانچہ آپ نے سیّد محمد حسین ابن سیّد جماعت علی شاہ کو بھی تعلیمِ دین سے بہرہ یاب فرمایا۔

بعد ازاں مدرسہ انوار العلوم شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۶ء تک تدریسِ علم کا کام کیا۔ یکم جنوری ۱۹۳۶ء کو مسجد ارائیاں بیرون کھیالی دروازہ گوجرانوالہ میں مدرسہ جامعہ عربیہ کی بنیاد رکھی ــــ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۷ء تک اسی مدرسہ کو رونق بخشی۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء میں گوجرانوالہ سے لاہور جانے والی سڑک جی۔ٹی روڈ کی مغربی سمت پر نہر اپر چناب کے تقریباً ایک ایکڑ شمال میں انتہائی پُر فضا مقام پر

ایک وسیع و عریض قطعۂ زمین پر جامعہ عربیہ کو منتقل کیا۔ جہاں آپ تا دمِ آخر تشنگانِ علم کو فیض یاب فرماتے رہے۔ چنانچہ آپ کے ہزاروں شاگرد، علمائے کرام کی مسند پر فائز ہو کر پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، ماریشس اور دنیا بھر میں دینِ متین کی تبلیغ و اشاعت کر رہے ہیں۔

مولانا محمد چراغ مدرسہ و منبر و محراب کی دنیا میں رہ کر بھی ملی تقاضوں سے غافل نہ رہے۔ جب یہ سمجھا کہ انگریز مسلمانوں کا دشمن ہے تو اس کے خلاف آزادی کی تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا ـــــ مہاراجہ کشمیر کے خلاف تحریک میں اکابرین کی گرفتاری کے بعد تیسرے یا چوتھے قائم مقام سربراہ مولانا چراغ بنے۔

تحریکِ اسلامی سے اپنا تعارف کا حال بیان کرتے ہوئے مولانا خود فرماتے ہیں کہ "قیامِ پاکستان سے پہلے قادیانیوں کے ایک مقدمے کے سلسلے میں ڈیرہ غازی خان گیا ہوا تھا۔ جہاں سردار محمد خان پتافی کے ہاں میں نے "ترجمان القرآن" کا ایک پرچہ دیکھا۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اور میں گورنمنٹ کالج لاہور کے فاضل پروفیسر مولانا کریم بخش کی معیت میں اسلامیہ پارک لاہور پہنچا اور ان سے بالمشافہ گفتگو کا پہلا موقع ملا۔ یہ بات اغلباً ۱۹۴۳ء یا ۱۹۴۴ء کی ہے اسی وقت سے میں ترجمان القرآن کا مستقل خریدار بن گیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد دہلی میں جمعیت علمائے ہند کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ مجھے بھی اس میں شرکت کرنی تھی۔ مولانا محترم نے مجھے اپنی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" پڑھنے کو دی اور مشورہ دیا کہ کانفرنس میں شامل ہونے سے پہلے اس کا مطالعہ کروں۔ لیکن جونہی میں نے اسے پڑھنے کے لیے کھولا۔ بالکل ابتدا ہی میں کانگریس کے لیے "بچۂ فرعون" کی ترکیب استعمال کی گئی تھی۔ چونکہ اس وقت میں کانگرسی تھا، اس لیے ان لفظوں سے دل کو ٹھیس پہنچی اور میں نے اس کتاب کا مطالعہ بند کر دیا۔ البتہ دہلی سے واپسی پر راستے میں، میں نے اس کتاب کا مطالعہ بالاستیعاب مطالعہ کیا تو آنکھیں کھل گئیں، مضبوط دلائل کی بے پناہ کاٹ نے باقی آرا کو صاف کر دیا۔ اور میں مولانا کے خیالات سے متفق اور مطمئن ہو گیا۔ (باقی بر صفحہ ۴۳)

قومیّت اور وطنیّت کی تحریک کا فروغ

اور

اس کا اسلامی حل

(۲)

جناب پروفیسر سیّد محمد سلیم صاحب

اس قوم پرستی میں لازماً چار عناصر پائے جاتے ہیں۔

۱۔ قوم پر فخر کرنے کا جذبہ:۔

یہ جذبہ اپنی قومی روایات اور خصوصیات کی محبت کو پرستش کی حد تک بڑھا کر لے جاتا ہے۔ دوسری قوموں کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے اپنی قوم کو بالا اور برتر قرار دیتا ہے۔

۲۔ قومی حمیّت کا جذبہ:۔

یہ جذبہ حق و انصاف کے سوال کو نظر انداز کر کے آدمی کو ہر حال میں اپنی قوم کا ساتھ دینے پر آمادہ کرتا ہے خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر۔

۳۔ قومی تحفظ کا جذبہ:۔

یہ جذبہ قوم کے واقعی اور خیالی مفادات کی حفاظت کے لیے ہر قوم کو ایسی تدابیر اختیار کرنے پر آمادہ کرتا ہے جن کا آغاز تو مدافعت سے ہوتا ہے لیکن جن کا اختتام حملہ آور ہونے پر ہوتا ہے۔ مثلاً غیر قوموں کی مہاجرت پر پابندی عاید کرنا۔ ان کی تعداد کو تشویش کی نگاہ سے دیکھنا، اپنے حدود میں دوسروں کے لیے کسبِ معاش اور شہری

حقوق کے دروازے بند کر دینا، ملکی دفاع کے لیے بڑھ چڑھ کر فوجی قوت فراہم کرنا۔ دوسرے ملکوں میں اپنی قوم کے حقوق کی حفاظت کے لیے دوڑ جانا۔ ہر طرح معاشی مفادات کی حفاظت کرنا۔

۴۔ فخر و مباہات کا جذبہ:۔

شروع میں تو یہ قومی افتخار تک ہی محدود رہتا ہے مگر بعد میں یہ داعیہ ابھرتا ہے کہ دوسری قوموں پر غالب اور برتر ہوں۔ دوسروں کے خرچ پر اپنی خوشحالی بڑھائیں۔ دوسروں میں اپنی تہذیب و ثقافت پھیلائیں۔ اور دوسری کمزور قوموں کا استحصال کریں۔

قوم پرستی کے اس نشہ سے سرشار ہو کر یورپ کا ہر ملک انا ولا غیری کا نعرہ بلند کرنے لگا۔

جرمن ——— "جرمنی سب سے بلند و بالا ہے۔"

امریکی ——— "امریکہ خدا کا اپنا ملک ہے۔"

برطانوی ——— "حکومت کرنا برطانیہ کا حق ہے۔"

اطالوی ——— "اطالیہ کی تقدیس ہی مذہب ہے۔"

ہر ملک کا یہ قومی عقیدہ ہے "میرا ملک خواہ حق پر ہو یا ناحق پر ہو۔"

قوم پرستی کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی قوم سے محبت رکھتا ہے اور اس کو آزاد اور خوشحال اور برسر ترقی دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو بہت اچھا ہوتا۔ یہ تو ایک شریفانہ جذبہ ہے۔ مگر قوم پرستی درحقیقت عداوت، نفرت اور انتقام کے جذبات کو جنم دیتی ہے اور پرورش کرتی ہے۔ بظاہر اس کا آغاز ان بے انصافیوں کی تلافی کرنے کی غرض سے ہوتا ہے جو کسی قوم کے ساتھ کسی دوسری قوم یا قوموں نے واقعی یا خیالی طور پر کی ہوں۔ مگر چونکہ کوئی اخلاقی ہدایت، کوئی روحانی تعلیم کوئی الٰہی شریعت اس کی رہنمائی کرنے والی اور اس کو ضابطہ میں رکھنے والی نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ جذبات اپنی حد سے گزر کر جارحیت، معاشی قوم پرستی، نسلی منافرت

جنگ اور بدامنی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

قوم کا پرستی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کی غیرت قومی اس بات کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی کہ وہ ایسے لوگوں کو بزرگ سمجھے اور ہیرو بنا لے جو اس کی اپنی قوم کے نہیں ہیں۔ وہ اس کو بھی گوارا نہیں کر سکتی کہ ایسے مقام کی مرکزیت، تقدیس اور احترام کو قبول کرے جو اس کے اپنے وطن کے نہیں ہیں۔ ایسی زبان کا تہذیبی اثر قبول کرے جو اس کی اپنی زبان نہیں ہے۔ ان روایات سے روحانی فیض حاصل کرے جو خارج سے درآمد کردہ ہوں۔ وہ ان سب چیزوں کو نہ صرف بدیسی قرار دیتی ہے بلکہ انہیں اس نفرت اور ناگواری کی نظر سے دیکھتی ہے، جس طرح بیرونی حملہ آوروں کی ہر شے دیکھی جاتی ہے۔ وہ ہر قسم کے خارجی اثرات کو اپنی قومی زندگی سے نکال دینے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے جذبۂ قوم پرستی کا فطری تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی سرزمین، دریاؤں، پہاڑوں اور صحراؤں کی تقدیس اور حمد کے گیت گاتا ہے۔

ہٹلر کے دور میں نازی جرمنی قوم پرستی کی معراج کو پہنچا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں بعض جرمنوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے علانیہ بیزاری کا اظہار کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ یہودی النسل تھے۔ وہ آریہ نہیں تھے۔ لیکن جن نازیوں کے دل میں ابھی تک حضرت مسیح کے لیے نرم گوشہ باقی تھا وہ ان کو یہودی نہیں مانتے تھے۔ بلکہ نارڈک نسل کا مانتے تھے۔ ایسا ہی ایک واقعہ علامہ شکیب ارسلان نے لکھا ہے۔ جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء–۱۹۱۸ء) سے قبل وہ ترکی میں ریل میں سفر کر رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکوں میں تورانی قوم پرستی کی تحریک اپنے عروج پر تھی اور عربوں سے نفرت تھی۔ ایک ترک کہہ رہا تھا کہ عرب ذلیل ہیں، عزت کے تصور سے ہی آشنا نہیں ہیں۔ "میں نے بیچ میں لقمہ دیا کہ یہ عزت کا لفظ کس زبان کا ہے"۔ اس نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔ "ترکی ہے"۔

جرمنوں کے نزدیک دین و ایمان سب کچھ جرمنی تھا۔ اور جرمنی کا قائد اڈولف ہٹلر تھا۔ جس کا اظہار ایک نازی وزیر ہر فریڈرک نے اس طرح کیا ہے:

"ہٹلر کی خدمت کرنا جرمنی کی خدمت کرنا ہے۔ اور جرمنی کی خدمت کرنا خداوند تعالیٰ کی خدمت کرنا ہے۔ ہٹلر کا ہر فیصلہ خیر ہے اور ابد تک خیر رہے گا۔ ہٹلر کی خدمت کے لیے ہر ذریعہ استعمال کیا جا سکتا ہے، خواہ بظاہر وہ غیر اخلاقی نظر آئے۔"

قوم پرستی کی تحریک بالآخر اس نقطہ کمال پر پہنچ کر رہتی ہے۔ اطالیہ میں یہی ہوا۔ فرانکو کے اسپین میں یہی ہوا۔ قوم پرستی کی کوئی تحریک ابھی درمیانِ سفر ہی ہے تو ضرور ایک دن وہ اس منزل پر جا کر دم لے گی۔ دنیا کے ہر قوم پرست اور وطن پرست کے نہاں خانۂ دل کی آواز تو یہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر قوم پرست اس جرأت اور بے باکی کے ساتھ اپنا مدعا ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا جس بے باکی سے ہر فریڈرک نے ظاہر کر دیا۔

اقلیتوں کی زبوں حالی قوم پرستانہ حکومت کے اندر دین، مذہب، اخلاق، حقوق کی کوئی ضمانت نہیں۔ قومی حکومت کی دراز دستیاں جس کا چاہیں حلیہ بگاڑ سکتی ہیں کوئی پوچھنے والا نہیں کوئی ہاتھ روکنے والا نہیں۔ سب سے زیادہ بُرا حال قوم پرستانہ تحریک کے اندر اقلیتوں کا ہوتا ہے۔ خواہ وہ اقلیتیں مذہبی ہوں، لسانی ہوں، نسلی ہوں یا کسی اور نوعیت کی ہوں وہ اکثریت کے رحم و کرم پر ہوتی ہیں، وہ جیسی چاہے ان کی درگت بنالے۔ اکثریت کی اندرونی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اقلیت کے اندر شکست و ریخت کا عمل جاری ہو۔ اور وہ اقلیت اکثریت کے اندر مدغم ہو جائے۔ ان کا جداگانہ وجود ختم ہو جائے۔ خواہ ملکی دستور میں اقلیتوں کے تحفظ کی کیسی ہی معرکہ آرا ضمانتیں درج ہوں۔ سابق دور میں ظلم و ستم کے خلاف اقلیتیں بادشاہ یا حکمران سے اپیل کر سکتی تھیں۔ خدا کے نام پر رحم کی درخواست کر سکتی تھیں۔ مگر قومیت کے دور میں یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ وطنیت کے دیوتا کے کان بانسولی سے بہرے ہوتے ہیں۔ اقلیتوں کی آہ و بکا کی وہاں رسائی نہیں ہوتی۔

ہٹلر نے یہودی اقلیت کو بالکلیہ ہلاک کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ واضح رہے کہ

جنگِ عظیم اوّل میں جرمنی کے یہودیوں نے اتحادیوں انگریزوں کے ساتھ سازش کر کے جرمنی کو شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں انگریزوں نے یہودیوں کو فلسطین کا تحفہ عطا کیا۔ (اعلان بالفور ۱۹۱۷ء) اس غداری کا ہٹلر نے یہودیوں سے سخت انتقام لیا۔ مختلف طریقوں سے ان کو ہلاک کرنے کی اسکیمیں بنائیں۔ مثلاً ایئر کنڈیشنڈ بسوں میں یہودیوں کو مختلف مقامات سے لایا جاتا تھا۔ راستہ میں بس میں سے ساری ہوا کھینچ لی جاتی تھی۔ دم گھٹنے سے سب مر جاتے تھے۔ بعض جگہ یہودیوں کو افقی طور پر مشرق رویہ اور شمال رویہ اوپر تلے لٹا دیا جاتا تھا۔ جس طرح ٹال میں لکڑیاں چُنی جاتی ہیں۔ پھر اُن پر چونا ڈال دیا جاتا تھا۔ اوپر سے پانی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ چونا پکتا تھا، کھد کھداتا تھا زندہ انسان اس میں جھلس جاتے تھے، جل کر کوئلہ ہو جاتے تھے۔ اُن کے لیے ایک گیس چیمبر بنایا گیا تھا۔ اس میں زندہ انسانوں کو پھینک دیا جاتا تھا۔ چھ فٹ کا آدمی سکڑ کر تین فٹ کا بونا بن جاتا تھا۔ یہودیوں کی مردہ لاشوں کو بھٹی میں جلایا جاتا تھا چربی علیحدہ نکالی جاتی تھی جس سے صابن بنایا جاتا تھا۔ چہرہ کی کھال سے عورتوں کے لیے پرس تیار کیے جاتے تھے۔ ہڈیوں کو پیس کر کھیتوں کے لیے کھاد تیار کی جاتی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ کے بعد جرمنوں کے خلاف اتحادیوں نے مقدمات قائم کیے۔ ان میں یہ تفاصیل بیان کی گئی ہیں۔ (NUREM BERG TRIALS)

حکمران اکثریت اگر اقلیت کے مقامِ رہائش سے کسی نوع کا خطرہ محسوس کرتی ہے تو اقلیت کو وہاں سے اکھاڑ کر کہیں دور پھینک دیتی ہے۔ کریمیا یورپ میں تاتاری مسلمان گذشتہ چھ صدیوں سے آباد چلے آ رہے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد روس کے ڈکٹیٹر اسٹالن نے فیصلہ کیا کہ ایسے حساس علاقہ پر مسلمان اقلیت کا موجود ہونا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس کے بعد بغیر پیشگی اطلاع کے، بغیر کسی آبادکاری اسکیم کے، ایک رات سارے علاقے کو روسی فوجوں نے گھیر لیا۔ لاکھوں تاتاریوں کو ٹرکوں میں لاد کر تین ہزار میل دور سائبیریا کے برفستانوں میں لے جا کر چھوڑ دیا۔ جہاں لاکھوں انسان بے گھر، بے در سردی میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر گئے۔ کوئی اُن کا پُرسانِ حال

نہیں تھا۔

حکمران اکثریت اگر اقلیت کی شرح پیدائش سے خطرہ محسوس کرتی ہے تو زبردستی ان کی آبادی کم کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی شرح پیدائش سے خطرہ محسوس کر کے اندرا گاندھی نے مسلمان مردوں کو زبردستی خصی بنانے کا منصوبہ بنایا۔ رات کو مسلح پولیس مسلمانوں کے محلوں کا محاصرہ کر لیتی تھی۔ گھر میں گھس کر مردوں کو پکڑتی۔ اس شور و واویلا میں ڈاکٹر اُن کو خصی کر ڈالتے تھے۔ جس کے بعد کسی طبی امداد کی اور نگرانی کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جاتی تھی۔

اقلیتوں کی زبان محفوظ نہیں رہتی۔ پولینڈ اور یوگوسلاویہ میں آباد ترکوں اور تاتاریوں کو وہاں کی حکومت مجبور کر رہی ہے کہ وہ ترکی زبان ترک کر دیں۔ اقلیتوں کا اپنا رسم الخط محفوظ نہیں۔ صدیوں سے رائج ترک اقوام میں عربی رسم الخط کو روسی حکومت نے متروک قرار دے دیا ہے اور روسی خط اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ ماوزے تنگ نے چین میں اویغور زبان کا رسم الخط عربی سے لاطینی میں تبدیل کر ڈالا۔ روس، یوگوسلاویہ اور ہندوستان میں لاکھوں مساجد پر تالے ڈالے گئے ہیں۔ دینی کتب ضبط کر لی گئی ہیں۔ (روس) دینی تعلیم ممنوع ہے۔ یوگوسلاویہ میں ترکی نام رکھنے کی اجازت نہیں ہے، ختنہ کرانے سے روکا جا رہا ہے۔ انگلستان جیسے آزاد ملک میں بھی مساجد میں اذان دینے پر پابندی ہے، جانور ذبح کرنے پر پابندی ہے۔ وطن پرستی اور قوم پرستی کے تحت اقلیتوں کی زندگی اجیرن ہے۔ وہ اکثریت کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہیں اقلیتیں سخت ضیق میں زندگی بسر کرتی ہیں۔

قوم پرستی عالم مشرق میں ایشیا اور افریقہ کے ممالک اپنی طویل تاریخ میں وطنی تصورِ قومیت سے ناآشنا تھے، بیگانہ تھے۔ یہ پودا یورپی اقوام نے حکمران بن جانے کے بعد محکوم قوموں میں افتراق اور انتشار پیدا کرنے کے لیے لگایا ہے۔ انہوں نے وطنی اکثریت اور وطنی اقلیت کے نسخہ کو خوب آزمایا۔ حکومت کرنے میں اس کو بڑا مفید پایا۔ وطنی قومیت کے مسلک میں کسی گروہ کو یہ کہہ دینا کہ وہ غیر ملکی ہے، بدیسی ہے اس کو کافر

قرار دینے اور شیطان قرار دینے کے مترادف ہے۔ پھر اس بیچارے مظلوم گروہ کا نہ کوئی حامی و ناصر اور نہ پرسانِ حال۔

نپولین پہلا شخص ہے جس نے یہ حربہ آزمایا۔ ۱۷۹۹ء میں اُس نے مصر پر حملہ کیا۔ اپنے حملہ کے جواز میں اس نے اپنے اس "نیک عزم" کا اظہار فرمایا کہ:

"ایک مدت سے مصر پر غیر مُلکی لوگ حکمران ہیں۔ ان کو نکال کر مقامی عربوں کو حکمران بنانے کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔ عرب شاندار تاریخ رکھنے والی ایک قوم ہے اور آئندہ بھی وہ شاندار کارنامے انجام دے گی۔"

نپولین یہاں جن حکمرانوں ——— مملوکوں ——— کو غیر مُلکی قرار دے رہا ہے وہ مصر میں کئی صدیوں سے چلے آرہے تھے۔ مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کے لیے اس نے یہ شوشہ بھی چھوڑا تھا کہ وہ مسلمان ہوگیا ہے۔ سادہ لوح مسلمان اس سے بہت خوش ہوئے، حالانکہ یہ استعمار کی چالیں تھیں۔

نپولین کے اس اعلان کی سب سے زیادہ قدر افزائی ہندوستان کی انگریزی حکومت نے کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے اس سے شہ پاکر ایک ملازم کے ذریعہ اعلان کرایا کہ "ہندو ہندوستان کے اصل باشندے ہیں اور مسلمان غیر مُلکی ہیں، بدیسی ہیں"۔ یہ سب کچھ ہندو اکثریت کو خوش کرنے کے لیے کیا گیا۔ اس سادہ سے جملے نے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور حقارت کا بیج بو دیا۔ اس درخت کے کڑوے پھل فسادات اور قتل و غارت گری کی صورت میں مسلمان گذشتہ پونے دو صدیوں سے چکھ رہے ہیں۔ پہلا ہندو مُسلم فساد انگریزی حکومت میں اس شوشہ کے چھوڑنے کے چند سالوں بعد ۱۸۰۹ء میں ہوا تھا۔ مغل دورِ حکومت میں کسی ہندو مُسلم فساد کا پتہ نہیں چلتا۔

مشنری اور مستشرقین استعمار کے ہراول دستے ہیں۔ مسلمانوں ملکوں میں وطنی قومیت کا بیج اُگانے، آبیاری کرنے اور فصل تیار کرنے کی بھرپور کوشش مستشرقین اور مورخین نے کی ہے۔ پروفیسر براؤن ایک ہمدرد ایران مستشرق سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب "تاریخ ادبیاتِ ایران" کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قوم پرستی کے بیج بونے میں

وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ کسی بھی ادیب، شاعر، اہلِ علم کا ذکر آئے تو وہ یہ بتانا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایرانی تھا، ترک تھا، عرب تھا، کرد تھا یا نومسلم یونانی تھا۔ اس طرح غیر شعوری طور پر قاری کے لاشعور میں وہ قوم پرستی کی تخم ریزی کرتے ہیں۔ اسلام کے آفاقی تصور قومیت پر چرکے لگاتے ہیں۔ تقریباً سارے مستشرقین کا یہی حال ہے۔ آج کل عالم میں اسلامی نظام حکومت اور اسلامی نظام عبادت کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں تو مستشرقین نے اس سے رُخ موڑنے کے لیے بالواسطہ تصوف اور صوفیاء کے گُن گانے شروع کر دیئے ہیں۔ مارٹن لنگ، رینے گینوں، اینی شمل سب اسی "کارِ خیر" میں مصروف ہیں۔

مغربی مورخین نے مسلمان ملکوں میں اسلام سے ماقبل کی تاریخ کو کھود کر نکالا ہے اس پر فخر و مباہات کے پھول برسائے۔ انہوں نے مصر میں فراعنہ کے دور کو، شام میں فینیقی عہد کو، عراق میں کلدانی اور بابلی تہذیب کو، ایران میں ہخامنشی اور ساسانی دور کو اور پاکستان میں موئن جو دڑو اور گندھارا تہذیب کو بڑے آب و تاب کے سامنے پیش کیا۔ مسلمان ممالک میں قدیم تہذیبوں سے متعلق اشیا کو عجائب خانوں میں نمایاں کیا گیا ہے۔ کثرت سے حاصل کر کے رکھا گیا ہے۔ ان میں اسلامی دور کی اشیاء بہت قلیل ہیں اور غیر جاذب ہیں، اس طرح کہ غیر شعوری طور پر ناظر کے دل میں اسلام کے مقابلہ میں قدیم تہذیب کی عظمت بیٹھ جائے۔ وہ غیر اسلامی دور پر فخر کرنے لگے۔ ان ممالک میں وطنی قومیت کی بنیاد غیر اسلامی تہذیب پر رکھی گئی ہے۔ اسلامی دور سے ذہنوں میں بُعد پیدا کیا گیا ہے۔ یہ مغربی اقوام ہیں جنہوں نے اپنے دورِ حکومت میں مشرقی اقوام کے اندر وطنی قومیت کی آبیاری کی اور پروان چڑھایا۔ انگریزی مورخ آرنلڈ ٹائن بی اعتراف کرتا ہے:

"نسل پرستی کی لعنت ہم نے (انگریزوں نے) پوری دنیا میں پھیلائی ہے۔ یہ اینگلوسیکسن اقوام کا پرانا مرض ہے۔ جو اب ساری دنیا کو لگ گیا ہے۔"

مزید برآں وہ اعتراف کرتا ہے:

"مختلف قوموں اور نسلوں کو پُر امن ماحول مہیا کرنے میں اسلامی تہذیب کو جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ کسی دوسری تہذیب کو حاصل نہیں ہوئی"۔[1]

EAST VERSKS WEST - BY ARNOLD TOYANBEE

بہرحال اب وطنی قومیت کا درخت عالم مشرق میں بھی برگ و بار لا رہا ہے۔ یہاں بھی اکثریت اور اقلیت کی آویزش شروع ہو چکی ہے۔ یہاں بھی اکثریت کے طور طریقے جابرانہ ہیں۔ دوسرے لوگ اس سے نالاں ہیں۔ اور اگر حسنِ اتفاق سے وہ نالاں اقلیت حکمران بن جاتی ہے تو اس کے طور طریقے سابق حکومت سے قطعاً مختلف نہیں ہوتے۔ پھر وہی دورِ استبداد کا دَور دَورہ ہوتا ہے۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

حقیقت یہ ہے سے

صاحب نظراں! نشۂ طاقت ہے خطرناک

وطنی قومیت کے منفی رجحانات زبان اور نسل کی بنا پر انسانوں کی شیرازہ بندی عالمِ مشرق میں خطرناک اور عدمِ استحکام کی حامل ہے۔ چند دُور دراز جزائر کو مستثنیٰ قرار دینے کے بعد دُنیا کا کوئی مُلک نہ یک لسانی ہے اور نہ یک نسلی۔ وہاں ایک لسانی اکثریت اور ایک نسلی اکثریت کا صاف اقتدار ہونا دوسری لسانی اور نسلی اقلیتوں کو کسی طور قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ ان کے مابین آویزش و چپقلش لازماً پیدا ہوتی ہے۔ پھر وطنی اکثریت اقلیت کی جو درگت بناتی ہے اس کا مختصر سا تذکرہ اُوپر گذر چکا ہے۔ اِس طرزِ حکومت سے نہ استحکام اور نہ سکون حاصل ہوتا ہے۔

[1] دیکھیے ضمیمہ نمبر ۱

حُبِ وطن اور حُبِ لسان کا نسخہ جب زیادہ استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے اندر سے منفی رجحانات نمودار ہونے لگتے ہیں۔ نہ زمین کی تحدید آخری ہو سکتی ہے اور نہ زبان کی۔ ان کے اندر تقسیم در تقسیم اور تفریق در تفریق کا عمل جاری ہو جاتا ہے۔ مرکز گریز قوتیں سرگرمِ عمل ہو جاتی ہیں۔

ع مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

اکثریت کے اندر ایک نیا معرکہ اکثریت و اقلیت برپا ہو جاتا ہے۔ ایک نیا محاذِ جنگ کھل جاتا ہے۔ جب یہ معیار تسلیم کر لیا جائے کہ میری سرزمین سے اچھی کوئی سرزمین نہیں اور میری بولی سے اچھی کوئی بولی نہیں تو جلد یا بدیر لازماً محاذ تو کھلنا ہے۔ اِس جنگ کو کسی ایک مرحلہ پر ختم نہیں کر سکتے۔ صوبوں کے اندر نئے صوبے تشکیل پاتے رہیں گے۔ باہمی کشمکش بہر کیف جاری رہتی ہے۔

ہمسایہ ملک ہندوستان میں آزادی کے بعد صوبوں کی تشکیلِ نو کی گئی۔ یہ تشکیل لسانی وحدت کے اُصول کی بنا پر کی گئی۔ اس طرح ایک رَو کا آغاز ہو گیا۔ اب یہ رَو رُکنے کا نام نہیں لیتی۔ تقسیمِ مُلک کے وقت پنجاب کے دو حصّے ہوئے۔ ایک پاکستان کے حصّے میں آیا اور دوسرا ہندوستان کو مِلا۔ وہ مشرقی پنجاب کہلایا۔ لسانی تحریکات کی بنا پر اب مشرقی پنجاب کے تین صوبے بن چکے ہیں۔ ہماچل پردیش، پنجاب اور ہریانہ پردیش۔ اسی طرح تقسیم مُلک کے وقت بنگال کے دو حصّے ہوئے۔ ایک پاکستان کے حصّے میں آیا۔ اور دوسرا ہندوستان کو مِلا جو مغربی بنگال کہلایا۔ وہاں بھی لسانی تحریکات چلیں، جن کی بنا پر اب مغربی بنگال کے اندر تین صوبے بن چکے ہیں یا بن رہے ہیں۔ میزورام، جھاڑکھنڈ، گورکھا لینڈ۔ اِن کے علاوہ ہندوستان میں کتنی ہی دوسری لِسانی تحریکات سرگرمِ عمل ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک لِسانی یا نسلی اقلیت اپنے لیے جداگانہ وطن کا مطالبہ کر دیتی ہے۔ مطالبہ کو عملی جامہ پہنانے تک ایک طویل صبر آزما اور جان گسل راستہ طے کرنا پڑتا ہے۔ مطالبے، جلسے جلوس، ہڑتال، پولیس سے تصادم، پہیہ جام ہڑتال، جلاؤ، گھیراؤ، قتل و غارت گری، قید و بند، کرفیو،

مارشل لا، مذاکرات، مفاہمت اور نئے صوبہ کا اعلان، بالآخر مرکزی حکومت کو جھکنا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ انتخابات کا طریقہ علاقائی اور گروہی رجحانات کو تقویت دیتا ہے اور ملکی اور اصولی مفادات کو پس پشت ڈال دیتا ہے، بلکہ قربان کر دیتا ہے۔

بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ افتراق کی قوتیں اور انتشار کا عمل صرف تیسری دنیا کے ممالک میں پایا جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں نہیں پایا جاتا۔ یہ رائے سرسری مطالعہ پر مبنی ہے۔ اس رائے میں ان تمام عوامل کی کارگذاری کو ملحوظ نہیں رکھا گیا، جو افتراق اور انتشار کی قوتوں کو ابھار دیتے ہیں یا دبا دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انتشار کی قوتیں وہاں بھی موجود ہیں، جب ہی تو آپ دیکھتے ہیں کہ متحدہ یوروپی ریاست کا خواب چالیس سال گذر جانے کے بعد ابھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ لکسمبرگ، السٹر اور دہی کن جیسی ننھی منھی ریاستیں بھی خم ٹھوک کے کھڑی ہیں۔ البتہ یہ بات ہے کہ مغربی ممالک میں انتشار کی بہ لے ابھی بہت دھیمی ہے۔

؎ دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے
بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

سارا کمال زخمہ ور کی چابک دستی کا ہے کہ اس نے مرض کو ابھی بڑھنے نہیں دیا۔

(باقی)

(بقیہ مولانا محمد چراغ کی یاد میں)

۱۹۴۸ء میں مولانا مودودیؒ گوجرانوالہ تشریف لائے، مگر مجھے اس وقت کی کوئی تفصیل یاد نہیں، البتہ جن دنوں اسلامی نظام کے لیے مہم چلا رہے تھے، میں نے خواب میں دیکھا کہ مولانا اکیلے ہی مسالہ وغیرہ لے کر شاہی مسجد کی مرمت کر رہے ہیں؛ اس سے میں یک سو ہو گیا کہ مولانا مودودیؒ اور ان کی برپا کی ہوئی تحریک برسر حق ہیں۔

(باقی)

امام ابوعبداللہ حاکمؒ

جناب عبدالرشید عراقی صاحب

امام حاکم کا نام محمد بن عبداللہ، کنیت ابوعبداللہ اور حاکم لقب تھا۔ اور عہدۂ قضا پر متمکن ہونے کی وجہ سے حاکم کہلاتے تھے[1] امام صاحب کی ولادت ۳ ربیع الاول ۳۲۱ھ کو نیشاپور میں ہوئی[2] امام حاکم ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد عبداللہ بن محمد اور ماموں علم و فن کے دلدادہ تھے۔ اس لیے امام صاحب بچپن ہی میں اپنے ان دونوں بزرگوں کی صحبت اور توجہ سے علم و فن کی تحصیل میں مشغول ہو گئے۔ چنانچہ امام حاکم نے سب سے پہلے اپنے والد سے تعلیم حاصل کی۔ آپ کے والد کو امام مسلم بن حجاج (م ۲۶۱ھ) کو دیکھنے کا بھی شرف حاصل تھا[3]

ارباب سیر کا بیان ہے کہ امام حاکم نے تقریباً ۲ ہزار علمائے کرام اور محدثین عظام

---

[1] ابوبکر خطیب بغدادی، تاریخ بغداد جلد ۵ ص ۴۷۳۔
احمد بن خلکان، وفیات الاعیان جلد ۳ ص ۳۸۴۔
عبدالرحمٰن بن علی جوزی، جلد ۷ ص ۳۷۴۔
تقی الدین سبکی، طبقات الشافعیہ الکبریٰ جلد ۳ ص ۶۴۔

[2] تقی الدین سبکی، طبقات الشافعیہ الکبریٰ جلد ۳ ص ۶۴۔

[3] شمس الدین ذہبی، تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۴۶۔

سے اکتساب فیض کیا۔ اور ایک ہزار کے قریب اساتذہ کرام کا تعلق آپ کے شہر نیشاپور سے تھا۔

علامہ شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے تذکرۃ الحفاظ میں اور علامہ تقی الدین سبکی (م ۷۷۱ھ) نے طبقات الشافعیۃ الکبرٰی میں آپ کے اساتذہ کی فہرست شائع کی ہے۔ جس طرح آپ کے اساتذہ کی فہرست طویل ہے، اسی طرح آپ کے تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے۔ آپ کے اساتذہ میں امام ابوالحسن دارقطنی (م ۳۸۵ھ)، اور آپ کے تلامذہ میں ابوبکر احمد بن حسین بیہقی (م ۴۵۸ھ) کے نام ملتے ہیں۔[1]

امام حاکم نے دوسرے محدثین کرام کی طرح تحصیل حدیث کے لیے دوسرے علمی شہروں کا سفر کیا۔ ۲۰ سال کی عمر میں آپ نے دوسرے مراکز حدیث کا رُخ کیا۔ اور عراق، بغداد، مکہ، کوفہ، مرو، بخارا، ہمدان اور اصبہان تشریف لے گئے۔ اور ہر جگہ آپ نے اساطینِ علم وفن سے استفادہ کیا۔ کثرتِ رحلت کی وجہ سے مؤرخین نے آپ کو طاف الآفاق اور رحل الکثیر کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔[2]

علمِ حدیث میں امام حاکم کو غیر معمولی کمال و امتیاز حاصل تھا۔ محدثین کرام اور اربابِ سیر نے آپ کو الحافظ الکبیر اور امام المحدثین وغیرہ کے القاب سے یاد کیا ہے۔ امام صاحب کو حدیث اور علوم حدیث میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ اور اس فن میں ان کا کمال اور مہارت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ان کے حفظ وضبط، اور ثقاہت وعدالت پر تمام ائمہ فن اور محدثین کا اتفاق ہے۔[3]

---

[1] شمس الدین ذہبی، تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۴۲، تقی الدین سبکی، طبقات الشافعیہ الکبرٰی جلد ۳ ص ۶۵۔

[2] ابوبکر خطیب بغدادی، تاریخ بغداد جلد ۵ ص ۴۷۳۔

[3] شمس الدین ذہبی، تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۴۲، ۲۴۳، احمد بن خلکان، وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۲۸۴۔

امام حاکم زہد و اتقاء اور دیانت و امانت میں ممتاز تھے۔ علامہ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) لکھتے ہیں کہ:

"حاکم متدین، امین، صاحب حزم و ورع اور اللہ کی جانب مائل و متوجہ رہتے تھے"[1]

علامہ ابن سبکی (م ۷۷۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

"امام حاکم کی عظمتِ شان، جلالتِ قدر، اور امامتِ فن پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ ان ائمہ اعلام میں سے تھے جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے دینِ مبین کی حفاظت کا کام لیا ہے۔ لوگ دُور دراز سے ان کی خدمت میں آکر اپنی علمی تشنگی بجھاتے تھے۔ وہ جس بزم میں پہنچ جاتے اس کی رونق بڑھ جاتی۔ لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے اور شایانِ شان استقبال کرتے۔ اکابر محدثین و نامور ائمۂ فن کے مجمع میں بھی تشریف لے جاتے، تو لوگوں کو اپنے علمی تبحر اور خوش کلامی سے متاثر کر دیتے تھے"[2]

امام ابو عبد اللہ حاکم نے ۸۴ سال کی عمر میں ۳ صفر ۴۰۵ھ نیشاپور میں انتقال کیا۔[3]

تصنیفات امام حاکم صاحبِ تصانیفِ کثیرہ تھے۔ اور ان کی تمام تصانیف کمیت و کیفیت دونوں حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اربابِ سیر کا اس پر اتفاق ہے کہ امام صاحب کی تصانیف کا مرتبہ بہت بلند تھا۔

علامہ ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

"حاکم نے علومِ حدیث میں بے نظیر تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں"[4]

---

[1] ابن کثیرؒ البدایہ والنہایہ جلد ا ص ۲۵۵۔
[2] تقی الدین سبکی۔ الطبقات الشافعیہ الکبریٰ جلد ۳ ص ۶۵۔
[3] شمس الدین ذہبی، تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۴۶۔
[4] احمد بن خلکان، وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۲۸۵۔

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) لکھتے ہیں:

"حاکم را درفنِ تصنیف وترتیب دخل تمام بود"۔[1]

امام صاحب کی جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ الاربعین ۲۔ الامالی ۳۔ امالی العشیات ۴۔ تراجم الشیوخ ۵۔ تراجم المسند علی شرط الصحیحین ۶۔ التلخیص ۷۔ فضائل الامام الشافعی ۸۔ فضائل العشرہ المبشرہ ۹۔ فضائل فاطمہ ۱۰۔ فوائد الخراسانیین۔ ۱۱۔ فوائد الشیوخ ۱۲۔ فوائد العراقیین۔ ۱۳۔ ما انفرد باخراجہ کل واحد من الامامین ۱۴۔ کتاب المبتداء من اللآلی ۱۵۔ مناقب الصدیق ۱۶۔ کتاب العلل ۱۷۔ تفسیر القرآن (اس کے بارے میں امام سیوطی (م ۹۱۱ھ) لکھتے ہیں کہ اس تفسیر میں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے آثار سنداً بیان کئے گئے ہیں)۔[2] ۱۸۔ تخریج الصحیحین یا المدخل الی معرفۃ الصحیحین۔ ۱۹۔ مزکی الاخبار ۲۰۔ کتاب الاکلیل ۲۱۔ المدخل الی علم الحدیث۔ ۲۲۔ تاریخ نیشاپور (یہ بڑی ضخیم کتاب ہے۔ اس میں امام ابوبکر خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) کی تاریخ بغداد کی طرح علمائے کرام اور مشاہیر فن کے تراجم درج ہیں۔ حاجی خلیفہ بن مصطفےٰ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ امام سبکی (م ۷۷۱ھ) نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"حاکم کے اس عظیم الشان کارنامہ کے سامنے نامور محدثین کرام کو سرنگوں ہو جانا پڑا۔ جو اس کا بغور مطالعہ کرے گا اس کو ان کے گوناگوں کمالات اور مختلف علوم میں جامعیت کا اندازہ ہو جائے گا"[3]

علامہ شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے اس کا مختصر تاریخ حاکم کے نام سے لکھا۔[4]

---

[1] شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین ص ۱۴۱

[2] جلال الدین سیوطی، الاتقان جلد ۲ ص ۱۹۰۔

[3] حاجی خلیفہ بن مصطفیٰ، کشف الظنون جلد ۱ ص ۳۴۵۔ [4] ایضاً ص ۳۲۳۔

۲۳۔ معرفۃ علوم الحدیث ۔ امام حاکم کی یہ کتاب علوم حدیث پر ایک یادگار تصنیف ہے۔ امام حاکم اس کے مقدمہ میں اس کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"میں نے دیکھا کہ بدعتوں کی کثرت ہو رہی ہے اور سنن سے عدم واقفیت کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ اور احادیث کے ضبط و تحریر کی طرف بھی توجہ نہیں کی جا رہی - اس لیے میں نے سوچا کہ ایسی کتاب ترتیب دے دوں جس میں مندرجہ بالا امور پر سیر حاصل بحث کروں - چنانچہ میں نے معرفۃ علوم الحدیث کتاب ترتیب دی[1]۔"

امام حاکم سے پہلے اس موضوع پر علوم حدیث پر جو کتاب لکھی گئی وہ علامہ ابو محمد حسن بن عبدالرحمٰن بن خلاد الہرمزی (م ۳۶۰ھ) کی، کتاب المدث الفاصل بین الراوی و الواعی ہے۔ لیکن اس میں مکمل استیعاب و استقصاء نہیں کیا گیا تھا[2]۔ امام حاکم کے بعد علامہ ابوبکر خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) نے کتاب الکفایہ اور حافظ ابن صلاح (م ۶۴۳ھ) نے مقدمہ ابن صلاح نے اس موضوع پر قلم اٹھایا - اور یہ دونوں کتابیں معلومات کے لحاظ سے بہت اہم اور مفید ہیں، لیکن امام حاکم کا شرف و تقدم مسلّم ہے۔

علامہ ابن خلدون م ۸۰۸ھ) لکھتے ہیں :

"علوم حدیث پر متعدد لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں، لیکن جو مرتبہ و مقام ابو عبداللہ حاکم کی معرفۃ علوم حدیث کا ہے، وہ کسی اور کا نہیں[3]۔"

صاحب کشف الظنون حاجی خلیفہ بن مصطفےٰ (م ۱۰۶۷ھ) لکھتے ہیں :

"حاکم کے بعد علامہ ابن صلاح نے علوم الحدیث کے نام سے بڑی اہم اور قابل ذکر کتاب لکھی - جو مقدمہ ابن صلاح کے نام سے معروف و مشہور ہے۔"

---

[1] ابو عبداللہ حاکم، مقدمہ معرفۃ علوم الحدیث ص ۱، ۲ -

[2] جلال الدین سیوطی، تدریب الراوی ص ۹ - ابن حجر عسقلانی، نخبۃ الفکر، ص ۳

[3] ابن خلدون - مقدمہ ابن خلدون ص ۴۸۵ -

اِس میں انہوں نے بعض انواع کا مفید اضافہ کیا ہے۔ لیکن حاکم کی حیثیت متقدم و متبوع کی ہے۔ اور ابن صلاح ان کے تابع ہیں۔ انہوں نے اکثر چیزیں حاکم کے حوالے سے لکھی ہیں۔[۱]

معرفۃ علوم الحدیث میں امام حاکم نے حدیث کے اسناد و متون وغیرہ گوناگوں انواع و اقسام اور راویوں کے مختلف درجات و طبقات اُن کے مراتب اور اُصولِ حدیث کے مہمات مسائل پر سیر حاصل عمدہ بحثیں کی ہیں۔ ہر مبحث کی تعریف، اہمیت، نوعیت اور ضرورت کو مثالوں سے واضح کیا ہے۔ اس سلسلے میں متقدمین کے کاموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ ہر بحث سے پہلے احادیث و آثار کو سنداً بیان کیا ہے۔

معرفۃ علوم الحدیث ۱۹۳۵ء میں مصر سے دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن کے اہتمام سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات و عربی کے سابق صدر ڈاکٹر سید معظم حسین نے ایڈٹ کر کے شائع کرائی۔ شروع میں ڈاکٹر معظم حسین نے ایک جامع و مبسوط مقدمہ رقم فرمایا ہے۔ جس میں امام حاکم کے حالات، علم حدیث پر ان کے کارنامے اور اُصول حدیث پر امہات الکتب کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔[۲]

۴۔ مستدرک حاکم۔ محدثین کی اصطلاح میں حدیث کی وہ کتابیں مستدرک کہلاتی ہیں جن میں ان حدیثوں کو نقل کیا جاتا ہے۔ جو حدیث کی کسی اور کتاب کی شرط کے مطابق ہونے کے باوجود اس میں درج ہونے سے رہ گئی ہوں۔[۳]

امام حاکم کی کتاب کا نام مستدرک علی الصحیحین ہے۔ اور اس میں ان احادیث کو شامل کیا گیا ہے جو امام صاحب کے خیال میں صحیحین کے معیار و شرائط کے مطابق ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔

---

[۱] حاجی خلیفہ بن مصطفےٰ، کشف الظنون جلد ۲ ص ۱۲۹۔

[۲] سید معظم حسین، مقدمہ معرفۃ علوم الحدیث۔

[۳] عبدالرحمٰن مبارک پوری، مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۳۷۔

مستدرک حاکم کا شمار حدیث کی اہم اور مشہور کتابوں میں ہوتا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) نے اس کو حدیث کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے[1]۔ حدیث کے تیسرے طبقہ میں امام دارمی (م ۲۲۵ھ) کی مسند دارمی، امام دارقطنی (م ۳۸۵ھ) کی سنن دارقطنی، امام ابوداؤد طیالسی (م ۲۰۴ھ) کی مسند ابی داؤد طیالسی، امام ابوبکر بن ابی شیبہ (م ۲۳۵ھ) کی مصنف جیسی بلند پایا کتابیں شامل ہیں۔ بعض محدثین کرام نے مستدرک حاکم کا مرتبہ امام ابن حبان (م ۳۵۴ھ) کی صحیح ابن حبان کے قریب قریب بتایا ہے[2]۔ حافظ ابن صلاح (م ۶۴۳ھ) اور امام نووی (م ۶۷۶ھ) صحاح ستہ کے بعد حدیث کی جن اہم کتابوں کو زیادہ قابلِ اعتماد اور پُراز منفعت قرار دیا ہے، ان میں امام دارقطنی (م ۳۸۵ھ) کی سنن کے بعد مستدرک حاکم کا نام لیا جاتا ہے[3]۔

امام حاکم نے مستدرک کی ترتیب، تبویب میں بڑی محنت کی ہے۔ امام صاحب لکھتے ہیں:

> "جہاں تک تلاش و اجتہاد نے میری رسائی کی ہے۔ میں نے خلفائے اربعہ کے فضائل سے متعلق وہ تمام احادیث جمع کر دی ہیں جو صحیح سندوں سے مروی ہیں اور جن کو شیخین (بخاری و مسلم) نے ترک کر دیا ہے۔ پھر میں نے کتاب کے نظم و ترتیب کے لحاظ سے یہ مناسب سمجھا کہ ان بزرگوں کے مناقب کے بعد دیگر صحابہؓ کے فضائل و فیات کو ترتیب سے جمع کروں۔"[4]

فضائل صحابہ میں امام صاحب نے صرف صحابہ کرام کے مناقب و فضائل بیان کرنے

---

[1] شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۶۔

[2] عبدالرحمن مبارک پوری، مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۷۸۔

[3] حافظ ابن صلاح، مقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۲۔
جلال الدین سیوطی تدریب الراوی ص ۳۰، ۳۱، ۲۶۰۔

[4] ابوعبداللہ حاکم، مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۱۸۰۔

پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ اُن کے سنین اور مختصر حالات بھی تحریر کئے ہیں[۱]

مستدرک حاکم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اِس میں بعض احادیث کے مراجع و مصادر کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اس سلسلہ میں امام محمد بن اسمٰعیل بخاری (م ۲۵۶ھ) کی الجامع الصحیح البخاری، امام مسلم بن حجاج (م ۲۶۱ھ) کی الصحیح المسلم، امام ابوداؤد (م ۲۷۵ھ) کی سنن ابی داؤد، امام ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی (م ۳۰۳ھ) کی سنن نسائی، امام مالک بن انس (م ۱۷۹ھ) کی موطا امام مالک اور امام محمد بن ادریس شافعی (م ۲۰۴ھ) کی المبسوط کا ذکر کیا ہے۔

مستدرک حاکم کی تلخیص حافظ ذہبی (م ۷۴۸ھ) اور علامہ سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے کی ہے[۲]

مستدرک حاکم دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن نے چار جلدوں میں تصحیح و تحشیہ کے بعد شائع کی ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۳۳۴ھ میں، دوسری جلد ۱۳۴۰ھ میں، تیسری جلد ۱۳۴۱ھ میں اور چوتھی جلد ۱۳۴۲ھ میں شائع ہوئی[۳]

مستدرک حاکم سے متعلق مولانا ابوالجلال ندوی سابق رکن دارالمصنفین اعظم گڑھ نے ایک مبسوط علمی و تحقیقی مقالہ لکھا تھا[۴] اور اس مقالہ کے جواب میں دائرہ المعارف کے رکن مولانا محمد ہاشم ندوی نے بھی ایک علمی مقالہ لکھا تھا[۵]

---

[۱] ابوعبداللہ حاکم، مستدرک حاکم جلد ۱ ص ۳۲۔
[۲] ضیاء الدین اصلاحی، تذکرۃ المحدثین جلد ۲ ص ۱۵۴، ۱۵۷۔
[۳] ایضاً ص ۱۵۸۔
[۴] معارف اعظم گڑھ، جولائی و اگست ۱۹۲۲ء۔
[۵] معارف اعظم گڑھ، نومبر و دسمبر ۱۹۲۲ء۔

رسائل و مسائل

اپنے لیے حجِ بدل

مولانا عبد المالک صاحب

سوال:۔ ایک آدمی کی پرورش اپنے نانا نے کی اور انہوں نے اپنی زندگی میں حج نہیں کیا، استطاعت نہ تھی۔ اب ان کے نواسے صاحبِ استطاعت ہیں، لیکن نانا جان اب بالکل معذور ہیں، وہ ان کی طرف سے کسی دوسرے آدمی کو حج پر بھیجنا چاہتے ہیں۔ اِس صورت میں:

۱۔ حج کس کی طرف سے ہوگا۔ نفل ہوگا یا فرض

۲۔ وہ آدمی نیت کیا کرے؟

۳۔ جس آدمی نے حج کرانے کا وعدہ کیا ہے۔ کیا اس پر بھی حج کرنا فرض ہے؟

۴۔ کسی کے فوت ہونے کے بعد بھی جو حج ہو اس کی کیا نیت ہو؟

جواب:۔ سوالات کا جوابات درج ذیل ہیں:

۱۔ اگر ایک شخص اتنی مالی حیثیت رکھتا ہے کہ اس پر حج فرض ہو، لیکن خود سفر کے قابل نہیں رہا تو وہ کسی بھی شخص کو چاہے اس کا نواسہ ہی کیوں نہ ہو، اپنی طرف سے حج پر بھیج سکتا ہے۔ حج پر جانے والا یہ ارادہ کرے کہ وہ اس شخص کی طرف سے حج کر رہا ہے، جو اُسے حج پر بھیج رہا ہے۔ اس شخص کے جملہ اخراجات بھیجنے والے کو برداشت کرنا ہوں گے اور حج بھی بھیجنے والے کی طرف سے شمار ہوگا۔

۲۔ اگر کسی شخص نے کسی سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اُسے حج پر بھیجے گا تو اسے اخلاقاً اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیئے، لیکن اگر اس نے خود حج نہیں کیا اور اس پر حج فرض ہے اور وہ حج پر جا بھی سکتا ہے، معذور نہیں ہے تو ایسے شخص کا کسی دوسرے کو حج پر بھیجنا، بھیجنے والے کے حج کا بدل نہیں ہوگا۔ البتہ رقم خرچ کرنے کا ثواب اسے ضرور مل جائے گا۔ انشاء اللہ۔

۴۔ کسی کے فوت ہونے کے بعد اس کی طرف سے حج کیا جا سکتا ہے۔ اس حج کا ثواب فوت ہونے والے کو ملے گا۔ اور اگر اس نے حجِ بدل کی وصیت کی تھی تو اس کی طرف سے حج بدل بھی ہو جائے گا۔

مطبوعات

اقضیۃ الرسولؐ (اُردو ترجمہ) تالیف: محمد بن فرج المعروف بابن الطلاع الاندلسی۔ تلاش نسخہ، تحقیق و حواشی از جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی، فیکلٹی آف حدیث، مدینہ یونیورسٹی۔ اُردو ترجمہ: زیر اہتمام ادارہ معارفِ اسلامی منصورہ۔ بہت بڑے سائز (۱۰¾ × ۷) کے ۹۲، صفحات۔ آراستہ و پیراستہ مضبوط جلد، سفید کاغذ، قیمت صرف ۱۶۵/- روپے۔ کتاب کو ایک نظر دیکھ کر آدمی یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ اتنی کم قیمت اس کی ہوگی۔

ایک نوجوان یوپی کے ہندو خاندان سے اُٹھا، وہ کلمۂ حق کے جام سے سرشار ہوا۔ خدا سے بندگی اور رسولؐ سے اطاعت کا پیمان باندھا اور اس کے لیے دیکھتے دیکھتے گھر تو گھر پورے وطن کی پھیلی ہوئی زمین اتنی تنگ ہو گئی کہ امن سے بیٹھنے کے لیے اسے جگہ نہیں مل رہی تھی۔ وہ چھپتا چھپاتا کبھی ایک جگہ جاتا، کبھی دوسری جگہ، ہر جگہ سرمستانِ تعصب پہنچ جاتے۔ یہ نوجوان ہندو غنڈوں کے ہاتھوں پٹا۔ خدا خدا کر کے کہیں چھپ چھپا کر میٹرک پاس کیا۔ پھر لیکا یک مولانا مودودیؒ کی کتاب دینِ حق کا ہندی ترجمہ پڑھا، جس کے متعلق ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اس نے میرے دل کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ پھر انہوں نے مولانا کی ہندی میں ترجمہ شدہ تمام کتابیں پڑھ ڈالیں، مگر پیاس تھی کہ اور زیادہ بھڑکی۔ پناہ گاہ کی تلاش میں جگہ جگہ پہنچے، مگر بالآخر درس گاہِ دارالاسلام بدایوں میں چار سال ٹک کر تعلیم پانے کا موقع ملا۔ فارغ ہونے پر ۱۹۶۶ء میں انہیں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ مل گیا۔ یہاں اعلیٰ دینی تعلیم کے بعد یہاں وہ فیکلٹی آف حدیث میں مامور ہوئے اور یہیں انہوں نے یہ تحقیقی کام کیا جس کا تعارف ہم کرا رہے ہیں۔ متعصب ہندو غنڈوں کا ستایا ہوا وہی نوجوان آج عالمِ اسلام کی

اعلیٰ یونیورسٹی میں شعبۂ حدیث کا ڈاکٹر پروفیسر ہے۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی کی متعدد تصانیف پہلے سے ہیں اور بعض نئی چیزیں لکھنا پیش نظر ہے۔

الطلاع الاندلسی کی متذکرہ کتاب سقوطِ اندلس اور بربادیٔ مسلمانانِ اندلس کے بعد نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی۔ دُنیا کی چند لائبریریوں میں اس کے مختلف نسخے موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے نسخہ محفوظہ بہ حرمِ مکی (نمبر ۱۳) پر توجہ کی۔ پھر دوسرے مختلف نسخوں کا مطالعہ کیا۔ متن کی صحیح اور جامع ترین شکل معین کی۔ پھر تمام متعلقہ احادیث کی تخریج کی۔ مندرجہ حوالہ جات و اقتباسات کے مصادر و مراجع دریافت کئے۔ اختلافِ مسالک اور مختلف الفاظ کے متعلق حواشی لکھے۔ رموزِ اوقاف کا اہتمام کیا۔ جدید معیارِ تحقیق کے مطابق ضروری ضمیمے پیش کئے۔ (تفصیل ملاحظہ ہو۔ ص ۴۷-۷۵)۔

مباحث میں اولاً یہ ہے کہ القضا فی الاسلام کیا ہے۔ دوسری قیمتی بحث امام ابن الطلاع کے دور کے اندلس کے حالات کے متعلق ہے اور اندلس کی علمی ترقی کی تحریک کے متعلق (پہلی تا پانچویں صدی)۔ پھر سیاسی بحث، پھر تعارف مؤلف، پھر مختلف عنوانات فقہی کے تحت آنحضورؐ کے احکام اور فیصلے بیان کئے گئے ہیں۔ اس باب کا دردناک ترین واقعہ یہ ہے کہ سقوطِ اندلس (۸۹۷ھ) کے وقت طلیطلہ کے لاٹ پادری نے مسلمانوں کی ایک لاکھ کتابیں جمع کر کے ان کو آگ لگا دی۔ پانچویں صدی میں علم کا اتنا فروغ ہوا کہ کتابوں کے ناموں کی ۴۴ فہرستیں (مجموعی ۸۰۰ صفحات) الحکم کی لائبریری میں موجود تھیں۔

آخر میں استدراک علی اقضیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (لابی محمد ابن فرج المعروف بابن الطلاع) شامل ہے۔

پہلا تاثر تو میرا یہ ہے کہ یہ ہمارے اسلاف کے چھوڑے ہوئے خزانہ ہائے علم میں سے بہت ہی بڑا ایک خزانہ ہے جس میں زندگی کے متعلق تحقیق شدہ احکام اور حواشی میں ان کے متعلق مختلف اجتہادی فقہی آرا مذکور ہیں۔

دوسرا تاثر میرا یہ ہے کہ اس دور کے حالات کے لحاظ سے حضورؐ کے دیئے ہوئے احکام

کے یکجائی مجموعوں کی بھی ضرورت ہے۔ مگر ساتھ ہی دوسری بڑی ضرورت خالص عدالتی فیصلوں کو الگ کرکے پیش کرنے اور یہ نتھار کر دکھانے کی ہے کہ یہ رسولؐ بہ حیثیت امیر کے احکام یا فیصلے نہیں ہیں۔ مجموعی فیصلوں کو تو ہم احکام القرآن کی طرح احکام الرسول یا احکام الحدیث کے عنوان سے لاسکتے ہیں۔ لیکن جب لفظ قضا آتا ہے تو مروجہ اصطلاحی معنی کے لحاظ پہ ذہن فوراً عدالتی کارروائی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

میرا تیسرا بڑا تاثر یہ ہے کہ مسائل واحکام پہ غور کرنے اور ان سے استنباط واستفادہ کرکے نئے اطلاقی اجتہادی احکامات برآمد کرنے والے یا ایسی بحثیں کرنے والی مجالس یا اداروں سے تو اس کتاب کا خاص تعلق ہے۔ رہے عام سطح کے آدمی، سو ان کے لیے مشکلات بڑھ جائیں گی۔ عام آدمیوں سے میری مراد ایک تو وہ لوگ ہیں جو ابھی دین کے اصولی احکام ومقاصد ہی کو نہیں پاسکے ہیں۔ اور عملی انحرافات بھی رکھتے ہیں اور ان کی تعداد بہت ہے۔ ٹھیک ہے کہ ان میں سے کم اِن کو پڑھیں گے۔ لیکن جو لوگ کچھ ابتدائی دینی رجحان رکھتے ہوں گے تو وہ اپنے مرتبے سے زیادہ آگے کے قضیوں میں اُلجھ جائیں گے۔ مگر ان میں سے بھی زیادہ وہ فریب خوردگانِ فرنگ ہیں جن کی برین واشنگ دو صدیوں سے ہو رہی ہے۔ اور اب بھی مسلسل لٹریچر، علوم، ثقافت، آرٹ اور مسائل زندگی کے متعلق ملحدانہ اور سیکولر بنیادوں پہ بحثیں پھیلاتے رہنے سے ہوتی رہتی ہے۔ احساسِ کمتری کے مارے ہوئے یہ لوگ اور ان میں علمِ مغرب کا بھرا ہوا اکبر آج کل جس سیکولر اسلام یا اسلامی لبرلزم کی شکل میں پھیل رہا ہے، اور پھر یہ لوگ عہدوں اور دولت اور سیاسی چمچہ گیری کی وجہ سے صحیح اسلامی تصورات کے خلاف رجعت پسندی اور ملائیت اور تنگ نظری اور علم دشمنی اور جمہوریت دشمنی اور فنڈا منٹلزم یا بنیاد پرستی کے طعنے دین کی ہر صدائے حق پر اور قرآن وحدیث کے بالکل صریح تقاضوں پر بلند کر رہے ہیں تو اندازہ کیجیے کہ ان کے حلقوں میں اگر اس کتاب کے حواشی کی وہ فقہی بحثیں پھیلیں جو ایک دوسرے کی کاٹ کرتی ہیں تو یہ لوگ ہمارے مختلف ائمہ کو دوسرے ائمہ کے خلاف کھڑا کرکے عین دین کے حقائق پہ ہاتھ صاف کر دیں گے۔ یہ پڑھے لکھے لوگوں کے فتنہ وضلالت کا ایسا خوفناک

دَور ہے کہ اس میں بڑی احتیاط کرنی چاہیے۔ بحث اور اختلافات اگر مخلصانہ ہوں تو اس کا مقصد تو حق کے زیادہ سے زیادہ بہتر تصور تک پہنچنا ہوتا ہے۔ بلکہ ایک صاحبِ دل کے قول کے مطابق فقہی بحث و تحقیق تو ذریعہ ہے خدا و رسولؐ کے قریب تر پہنچنے کا، مگر ہمیں خدا و رسولؐ سے فراریت پسندوں کے ایک جدید مُسلم گروہ سے واسطہ ہے۔ اعلیٰ عربی کتابوں کا ترجمہ کر کے اہلِ زیغ کے سامنے رکھنا اپنی مشکلات کو بڑھانا ہے۔

اب میں بعض قابلِ توجہ اشارات عرض کرتا ہوں:

اس کتاب کی کتابت متوسط سی ہے، لیکن اس کے شایانِ شان نہیں ہے۔ صرف ایک مثال دوں گا۔ ص ۲۴ کی پہلی دو سطروں میں "کا، کی، کریمہ، کی، کو، مشترک" وغیرہ کی کاف کی کششوں کی طوالتِ بے جا دیکھیے۔

ص ۲۵ پر حضرت زید بن ارقمؓ کی روایت سے حضرت علیؓ کی ایک مقدمے کی جو کارروائی بتائی گئی ہے، وہ بڑی حیران کُن ہے۔ تین آدمی ایک عورت سے ایک ہی طہر میں ہم بستری کرتے ہیں اور پیدا ہونے والے لڑکے کے متعلق ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ یہ میرا ہے۔ ان مردوں کی بے غیرتی کو جانے دیجیے کہ یہ لوگ ایسے گرے ہوئے تھے کہ وہ اپنی اس طرح کی حیوانی حرکت کو قاضی کے سامنے بیان کریں، زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ مقدمہ کی کہانی کے اس پہلے مجرمانہ حصے کا خفیف سا نوٹس بھی نہیں لیتے کہ یہ بات معمول کے بہت خلاف واقع ہوئی ہے۔ پھر اس کے بعد جس طرح لڑکے کے معاملے کا فیصلہ کرتے ہیں وہ قانونی کارروائی نہیں معلوم ہوتا۔ آخر میں قرعہ اندازی کرتے ہیں۔ اور یہ سب سُن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس زور سے ہنستے ہیں کہ ڈاڑھیں نظر آنے لگتی ہیں۔ پھر حضرت علیؓ نے اس قضیے سے متعلقہ عورت کو طلب کر کے اس کا بیان نہیں لیا۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ سند کے لحاظ سے یہ صحیح ہے مگر میں کہتا ہوں کہ درایت بھی تو کوئی چیز ہے! شریعت کے اُصول اور قضا کا قانون نہایت نازک اور سنجیدہ معاملے ہیں۔ کیوں نہ ہم ابوداؤد اور ابن ماجہ کی اس روایت کو وزن دیں کہ بعض اہلِ علم نے اسے مرسل ہونے کی بنا پر ضعیف قرار دے دیا ہے۔

عدت گزارنے والی عورت کی فقہی بحثیں بڑی طویل ہیں - میں صرف ایک جزئیہ نقل کرتا ہوں۔ "امام مالکؒ" اور "امام شافعیؒ" فرماتے ہیں کہ اُسے (طلاق دینے والے شوہر کے گھر میں) سکونت کا حق تو حاصل ہے، نفقہ کا نہیں"۔ چند اور ائمہ کی رائے بھی یہی ہے۔ مگر اس بے ذریعہ عورت کے نان ونفقہ کا کیا حل؟ یہ بات فقہاء نے سوچی ہی نہیں۔ حالانکہ وہ یہ تجویز دے سکتے ہیں کہ بیت المال سے اسے سہارا ملنا چاہیے - یا آجکل کے دور میں مثلاً زکوٰۃ فنڈ سے یا کسی جائنٹ سیکورٹی فنڈ سے، یا مصیبت زدہ خواتین کی مدد کے کسی فنڈ سے، لیکن وہاں مسئلہ بتا کر حل بتانے کی ذمہ داری سے کنارہ کر لیا گیا ہے۔

اسی طرح عدت میں گھر سے نکلنے نہ نکلنے کے مسئلے میں اختلافات ہیں۔ کوئی قولِ فیصل نہیں۔

ص ۳۴۷ پر حافظ ابن حجر کی یہ رائے درج ہے کہ "یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے تھی کہ آپ کی صاحبزادیوں پر دوسرے نکاح نہ کیے جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ صرف حضرت فاطمہؓ کے لیے خاص ہو"۔ (فتح الباری ۹ — ۳۲۹)۔ حضورؐ نے فرمایا یہ تھا کہ "اللہ کے نبی کی بیٹی کے ساتھ اللہ کے دشمن کی بیٹی کبھی اکٹھی نہیں ہو سکتی — مجھے اندیشہ ہے کہ فاطمہؓ اپنے دین کے سلسلہ میں فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائے"۔ (بخاری) اتنی صریح دلیل کے ہوتے ہوئے حضورؐ کی بیٹیوں کے لیے ایک اُصول عام بنانے کی کوئی گنجائش نہیں۔

ص ۲۹۴ کے حاشیے میں خواب بنائے روایت ہے اور روایت مرسل ہے اور نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ حضورؐ کی وجہ سے جناب ابو طالب کے عذاب میں تخفیف ہوگی۔ ایسی احتمالی چیزوں کو مدارِ بحث بنا کر علمی دائرے میں داخل کر دینا کیسے مناسب ہے۔ پہلے شرائطِ شفاعت و بخشش قرآن میں دیکھنی چاہییں۔

اس طرح کی اور بھی لمبی لمبی بحثیں تجزیہ طلب ہیں۔ مگر یہ کتاب حواشی کی بحثوں سمیت اہلِ علم دین اور محبانِ دین کے لیے ایک دولتِ بے پایاں ہے، مگر دین کا منہ نوچنے والے جدیدیوں کے لیے اس طمنچے کی طرح ہے جو بچے کے ہاتھ میں آجائے اور وہ اسے چھیڑتے چھیڑتے اپنے ہی اوپر گولی چلا دے۔

سیرتؐ مجمعِ کمالات | تالیف: جناب محمد عبدالجبار شیخ ۔ ناشر: ادارۂ تعلیماتِ سیرت، علامہ اقبال کالونی، سیالکوٹ کینٹ۔ صفحات: ۳۸۰۔ سفید کاغذ، دبیز رنگین سرورق تقسیم فی سبیل اللہ۔

یہ جناب مؤلف کے ۱۱ مقالاتِ سیرت کا مجموعہ ہے۔ ۱۱ کا عدد بھی اب بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اکثر ابواب اس طرح ہیں: کمالِ پیغامِ سیرتؐ، کمالِ عرفانِ نبوتؐ، کمالِ اسوۂ حسنہ، کمالِ نظامِ عدل، کمالِ حُسنِ معاشرت وغیرہ۔ جیسے ہمارے ایک محبِ مکرم نے لکھا تھا۔ سراپا عدل، سراپا رحمت، سراپا خلق وغیرہ، یہ بھی ایک خاص طرزِ ترتیب ہے۔

جناب مؤلف درسِ نظامی کے فاضل بھی ہیں، علومِ عصریہ سے آراستہ ہونے کی وجہ سے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی اپنے افاداتِ علمیہ کو پھیلاتے ہیں۔

اس کتاب کے تحسین آمیز تعارف کے لیے ۱۸ بلند پایہ علمی و دینی اور ادبی شخصیتوں نے بڑے شاندار اور پُرزور انداز میں لکھا ہے۔ ان ۳۸ صفحات کو پڑھنے کے بعد جرأتِ تنقید کہاں باقی رہتی ہے۔ ص ۳۲ پر پروفیسر ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک نے اس پرانی روایت کو نبھایا ہے کہ دو ایک مستشرقین کی شہادتیں حضورؐ کے متعلق پیش کی ہیں۔ یہ سلسلہ اس لیے متروک ہو گیا ہے کہ اکثر گواہوں کی تحریروں اور تحقیقات میں اسلام اور حضورؐ کے متعلق بڑے تضاد ہیں اور عملاً وہ ایک چیز کو حق قرار دینے کے بعد اُسے قبول نہیں کرتے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب کوئی کتاب سامنے آتی ہے تو ویسے بھی ادب مانع ہوتا ہے کہ اس سے برکت حاصل کرنے کے بجائے مؤلف کی مساعی کو زیرِ نظر لایا جائے۔ اور پھر دینی کتابیں لکھنے والے علماء کا احترام اپنی جگہ ہے۔ بزرگوں کی باتوں پہ کیا کہا جائے۔

تاہم جو پہلو میں نے محسوس کیے، عرض ہیں۔

مثلاً یہ کہ جناب مؤلف صاحبِ علم بھی ہیں اور ان میں جذبۂ محبتِ رسالتؐ بھی ہے اور وہ قوم کی بھلائی بھی چاہتے ہیں۔ مگر سیرت نگاری کے دو اہم راستوں میں سے کسی ایک

کے تقاضوں میں سے کسی ایک کی طرف بھی پوری طرح متوجہ نہیں ہو سکے، ورنہ مزا بامسرت ہوتی۔

تفصیل یہ کہ یا تو راستہ تحقیق کا راستہ ہے۔ آپ حقائق پر، وہ واقعات ہوں، سنین ہوں، افراد ہوں، اقوال ہوں، کارروائیاں ہوں اور اُن کے ہر جزو پر سوالوں سے تفصیل سامنے لاتے ہوئے بحث کرکے دکھائیں کہ قرآن اور حدیث کے بیانات کے مطابق کہاں کونسی صورت درست ہے۔

دوسری نوعیت سیرت نگاری کی یہ ہے کہ اس کے ذریعے دعوت احیائے اسلام اور درس اخلاق و کردار مسلمانوں تک نہایت مؤثر اور دلنشیں بلکہ کبھی کبھی جھنجھوڑ دینے والے انداز میں پہنچایا جائے۔

غالباً مؤلف کے پیش نظر دوسری صورت ہے۔ مگر اس کے تقاضے تب پورے ہوتے ہیں، جب آپ لوگوں کو منطقی انداز کی طرف نہ لے جائیں۔ بلکہ حضورؐ کی شخصیت اور کام کی درخشانیوں کو سامنے لاکر اُن کی طرف اپیل کریں کہ یہ ہے فلاح کی راہ۔ یہاں اس طرح کی کچھ بات آئی بھی ہے، وہاں انداز یہ نہیں ہے کہ آؤ اور ہم مل کے یہ پیغام عام کریں بلکہ یہ ہے کہ "اللہ کرے کوئی ایسی صورت نکل آئے"۔ (ص ۴۶) ۔ دعوت کے انداز میں بات ہو تو شمع اُمید روشن رہنی چاہیے اور برائیوں کے طوفان کے خلاف لڑنے یا مخالف ماحول کی اذیتیں سہنے کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے۔ لوگوں میں حق کی سربلندی کے لیے جذبے کا اُبھار موجود ہونا چاہیے۔

جناب محترم محمد عبدالجبار صاحب یقین کریں کہ میں ان کی کوشش اور جذبے کی دل و جان سے قدر کرتا ہوں کہ اور ان کے لیے خیرخواہی رکھتا ہوں۔ مگر میں یہ بات کہنے سے اپنے آپ کو کس طرح روکوں کہ سیرت کی کتابیں چند سال سے سٹیریو ٹائپ طرز کی آرہی ہیں۔ ایک سی باتیں اِدھر سے اُدھر الٹ پلٹ کر رکھ دی جاتی ہیں۔ کوئی نئے موضوع نکالیے، کوئی نئے مبحث پیدا کیجیے۔ گھسی پٹی عام سی باتوں کی تہ میں اُتر کر معلوم کیجیے کہ کیا کیا موتی مخفی پڑے ہیں۔

آپ خود ہی سوچیں کہ آج کا مغرب زدہ سرکش طبقہ جو معاشرے میں مسلط ہے وہ اگر اس کتاب کو پڑھے گا تو کتنے فی صد لوگ اصلاح پذیر ہو سکیں گے۔ یا ہمارے بگڑے ہوئے عوام

ہیں سے (ماسوا ان کے جو پہلے سے دین سے مس رکھتے ہیں) کتنے نئے لوگ راہِ حق پر آجائیں گے،
اور بدرجۂ آخر کتنے وابستگانِ دین کے قدم اور پکے ہو جائیں گے۔ یہ ہے دین کے کاموں کا معیار۔
آپ کے ہاں بعض ترجمے اور نتائج عجیب سے ہیں۔ مثلاً آیت "وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ ...... الخ" کا ترجمہ آپ یوں شروع کرتے ہیں۔ " اے پیارے نبیؐ!" یہ ترجمہ نہیں، زائد واعظانہ بیان ہے۔ پھر اس آیت کے آخر میں لَا یَعْلَمُوْنَ کا ترجمہ آپ نے کیا ہے" آپ کو اور آپ کی لائی ہوئی آفاقی قدروں کو نہیں جانتے"۔ یہ " آفاقی قدروں" کا قصہ کہاں سے آگیا۔ تفسیر آپ جو چاہیں کریں، ترجمہ میں یہ بات نہیں آسکتی۔ کہیں آپ کہتے ہیں " مجبوری سے پہلے پریکٹیکل کا ڈھب سکھا رہا ہے"۔ (ص ۶۵) ۔ دوسرے لفظوں میں عقاید وافکار سے پہلے اعمال[۱] ۔ یہی بات آپ نے پھر کہی " قول سے پہلے عمل کا پریکٹیکل سامنے رکھ دے" (ص ۶۶) ۔ " یہ عمل کا پریکٹیکل کیا ہوا؟ ایک فقرہ ہے۔۔۔۔" معاشی و سائنسی عوامل نے پوری دُنیا کو انسانوں کی ایک بستی کی صورت میں پلٹ کر رکھ دیا ہے"۔ (ص۶) "پلٹ کر رکھ دیا ہے"۔ نہیں " بدل دیا ہے"۔

اِن چھوٹی چھوٹی باتوں کو درکنار رکھ کر یہ کتاب مفید و مبارک ہے۔ اس میں بہت سی ضروری آیات واحادیث اور اقوالِ علما ہیں۔ مؤلف کے دردمندانہ احساسات ہیں، بہرحال ان کو پڑھ کر دینی سرمایۂ علم وجذبہ میں اضافہ ہوتا ہے۔

خدا کرے اس کتاب سے لوگ استفادہ کریں اور یہ پڑھنے والوں میں بہترین اثرات پیدا کرے اور مؤلف کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزا ملے۔

---

[۱] محترم مؤلف کو معلوم ہوگا ہی کہ جدید سوشل فلاسفی میں مادہ پرستوں نے یہ نزاع اٹھائی ہے کہ پہلے عمل اور واقعہ اور پھر علم۔ یعنی ہمارے عقیدے کی کاٹ ہے کہ پہلے خدا تعالیٰ کے علم نے نقشۂ خلق تیار کیا اور پھر اس سے وہ کارخانۂ عمل نمودار ہوا جسے کائنات وحیات کہتے ہیں۔ جو فلسفہ ہم خدا پرستوں کی بیخ کنی کے لیے استعمال ہو رہا تھا اُسے اُٹھا کے آپ اسلام کے نام سے سیرتِ پاک کی جلوہ گاہ میں لے آئے ہیں۔

ISLAM AND OTHER ECONOMIC SYSTEMS	از جناب پروفیسر مہر محمد نواز خاں - ناشر: اسلامک بک سروس - ۹۰ - اے، اردو بازار، لاہور-

صفحات: ۳۷۶ - صاف ٹائپ - قیمت پیپر بیک ایڈیشن -/۳۵ روپے مجلدہ ۲۲۵ روپے

ہمارے قرونِ رفتہ کے اعلیٰ لٹریچر میں بھی اعتقادی، اخلاقی اور فقہی امور پر جتنا وسیع کام ہوا ہے اس کے مقابلے میں اجتماعیات اور تمدنی ادارات اور ان کے نظریات و اصول پر مختصر بحثیں ملتی ہیں۔ اب جس دور سے ہم دوچار ہیں اس میں اجتماعیات اور منظمات کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے اور اقوامِ غالب نے ہر دائرۂ فکر و بحث میں اتنا سرمایۂ تحقیق و تجربہ مرتب کر دیا ہے کہ ان کے مقابلے میں ہم اپنے آپ کو پسماندہ سمجھنے پر مجبور ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کے انبوہِ کثیر فکرِ اغیار کے سامنے آسیب زدہ ہو کے رہ گئے ہیں۔

ایسے حالات میں ایک گروہ وہ ہے جو اسلام کی اٹل صداقتوں پر یقینِ کامل رکھتے ہوئے اجتماعیات کے دائرے میں اپنے سرمایۂ علم کو جلد سے جلد بڑھانے کی مہم میں مصروف ہے جس کے لیے سارے بنیادی تصورات ہمارے ہاں کتاب و سنت کے مطابق علومِ اسلاف میں موجود ہیں۔

اسی مقام کی ایک شخصیت جناب پروفیسر محمد نواز خان کی ہے، جن کی صریر خامہ جھنگ جیسے علاقے سے سنائی دی، جہاں یا تو بھینسیں ہوتی ہیں یا بین۔

موصوف کو میں اس کوشش پر داد دیتا ہوں کہ انہوں نے اسلامی نقطۂ نظر اور معاشی مباحث پر بات کرتے ہوئے خود بھی سوچا ہے اور دنیا کے بہت سے مفکرین کو بھی ساتھ لے کے چلے ہیں۔ انہوں نے اچھی انگریزی میں کتاب لکھی ہے۔

ہمارے پاس اعلیٰ درجے کے اقتصادی ماہرین کم ہیں، ان میں لکھنے والے اور کم ہیں اور لکھنے والوں میں سے تحقیق و تخلیق کے نادر کارنامے سامنے لاسکنے والے تو خیر کیا کہیں۔

پھر ہمارے لکھنے والوں کی ایک مشکل یہ ہے کہ زمانے کی ہوا اور غالب قوتوں کی نوا کے سامنے چلنے والے مفلوج الضمیر مقلدوں کو چھوڑ کر، جو مبارک لوگ آزادیٔ روح و ایمان و اولہ

بقائے خودی سے آراستہ ہو کر کام کر رہے ہیں وہ بھی اس مشکل میں گرفتار ہیں کہ اخلاقی نظریات اور نظاموں کا اتنا بڑا طوفان اُن کو گھیرے ہوئے ہے کہ وہ جب اسلامی اقتصادیات پر لکھنے بیٹھتے ہیں تو اس طوفان کے تھپیڑوں کے زیرِ اثر وہ مخالف نظریات اور نظاموں کو بحث کی لپیٹ میں لیے بغیر چل ہی نہیں سکتے، ورنہ اُن کے قاری بھی اُلجھ جائیں۔

حالانکہ سرمایہ داری کے عیوب برہنگی کو نمایاں کر کے جن لوگوں نے اشتراکیت کا تجربہ شروع کیا تھا، ان کے تجربے کا ماحصل آج پون صدی میں مکمل طور پر سامنے آگیا ہے۔ لاکھوں انسانوں کی ہلاکت اور کروڑوں کو جبریت کے جبل میں مرتبۂ حیوانیت پر رکھنے سے سوائے اس کے کیا ملا کہ ضروریاتِ زندگی کی قلت، مزدوروں اور کمزوروں کی اور زیادہ محرومی، ذہنوں اور نسلوں کو تباہ کرنے کی جنگِ مسلسل، مصنوعات کے معیار کی پستی، معاشرے میں ہر طرف خیانت کا دَور دَورہ، اور ہر فرد کی بے اطمینانی —— اور اب اس کا نتیجہ نظام میں داخلی شکست و ریخت۔

یہی انجام ہوتا ہے انسانی فلسفوں اور نظاموں کا!

پروفیسر مہر محمد نواز خاں صاحب نے اسلامی اور مخالفِ اسلام نظاموں کا تقابلی مطالعہ بھی کرایا ہے اور خود اسلام کو بھی، اعتقادی، اخلاقی، قانونی، سماجی ہر پہلو سے دکھا کر واضح کیا ہے کہ اسلام کے سادہ سے اُصولِ معیشت انسانیت کے لیے کس درجہ باعثِ خیر و فلاح ہیں۔ انھوں نے فلاح کے مفہوم ہی کی جو وضاحت کی ہے۔ اسی پر دل عش عش کر اُٹھا۔

مگر یہ ضرورت باقی ہے کہ خود اسلامی معیشت کے پورے اُصول و فلسفہ اور ادارات و نظام کو نہ صرف تحقیق و تفصیل سے سامنے لایا جائے بلکہ آج غیر اسلامی فکر و معیارِ زندگی نے انسانوں کو جس مشکل میں ڈال دیا ہے، اُس سے ان کو کیسے نجات دلائی جائے۔ اسراف کیا ہے۔ قومی دولت اور اجتماعی ضروریات کا لحاظ رکھ کر افراد کی دولت و ملکیت اور آمد و خرچ پر کیا تحدیدیں اجتہادی تدابیر کے طور پر کی جا سکتی ہیں۔ اسلامی کفالتِ عامہ کا تصور

کیا ہے اور اس کے وسیع نقصانوں کو پورا کرنا کس طرح ممکن ہے ۔ زمین یا دولت کی ایسی بہت بڑی انفرادی ملکیتیں جو فسادِ اخلاق، ظلم، اغوا، جتھابندی، غنڈہ گردی، دولت اور زرینگیں افراد کے ذریعے سیاست میں ضرر رساں دخل اندازی اور جمہوریت کی رُوح کی تباہی کا سبب بن جائیں ۔ ان سے متعلق کیا مؤثر اقدامات کیے جا سکتے ہیں ۔ بنکنگ بلاسُود کا بالکل پاک صاف نظام کیا ہو سکتا ہے ۔ وغیرہ !

بہ ثبت کام اگر ہم کتاب و سنّت کی پوری پابندی کے سامنے کسی قدر اجتہادی (نہ کہ انحرافی یا باغیانہ) نقطۂ نظر سے کر سکیں تو اس کی بنیاد پر دوسرے تمام فلسفوں اور نظاموں کا مقابلہ کرنا زیادہ آسان ہے ۔ ایسی کچھ باتیں مہر محمد نواز خاں کے ہاں بھی ہیں، دوسرے معاشی مصنّفین کے ہاں بھی، مگر ابھی وہ بات نہیں بنی کہ :

ع حالیا ! غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

ماہنامہ ظرافت ایڈیٹر: ضیا الحق قاسمی (برادر عطاء الحق قاسمی) ۔ اہم شخصیتوں کی مجلسِ مشاورت ۔ مقام: ۱۰۰/۱۸ اسحٰق آباد، سر شاہ محمد سلیمان روڈ، لیاقت آباد، کراچی ۔ کوڈ نمبر ۷۵۹۰۰ ۔ فی پرچہ: ۷/- روپے ۔ سالانہ ۷۰/- روپے ۔

قابلِ داد ہے ظرافت کا جواں سال ایڈیٹر جو بدلِ فتنہ فتنہ و حرفِ قند قند جرم و تشدد، خیانت و انتقام اور خون اور آنسوؤں کے ماحول میں مسرت کے پھول بکھیرتا نکلا ہے ۔ جہاں مجالسِ ماتم کی آنکھوں میں آنسو ہیں، وہاں اس کے دم سے لبوں پر تبسّم رقصاں ہے — آگ پانی کا کھیل ہے ۔ ایک گذارش ! اہلِ ظرافت اگر معاصرین سے دست و گریباں ہو جائیں اور ہر پرچے کے ہر گوشے میں اسی لپاڈگی کے تذکرے ہوں تو بی بی ظرافت کو دمہ ہو جاتا ہے ۔ ذرا بچ کے !

ہفت روزہ قیامت مدیر اعلیٰ ظفر اعوان ۔ دفتر اشاعت: نزد چونگی ۲۰ ۔ اڈیالہ روڈ ۔ راولپنڈی ۔ فی پرچہ ۷/- روپے ۔ سالانہ ۳۲۰/- روپے ۔ معلومات کا دائرہ وسیع ۔ ملکی اور غیر ملکی خبریں ۔ بیانات، رپورٹیں، تبصرے اور مزاح ۔ قدرے اپوزیشن کی طرف میلان ۔

ماہنامہ الفاروق | بہ اہتمام صدارت جامع فاروقیہ کراچی۔ مدیر اعلیٰ: مولانا محمد عادل خان (مع مشاورتی بورڈ)۔ پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۱۱۰۰۹ - شاہ فیصل کالونی نمبر ۴ کراچی ۲۵ - پوسٹ کوڈ نمبر ۷۵۲۳۰ - اچھا سفید کاغذ اور ٹائپ، خوبصورت ٹائٹل - فی کاپی -/۱۲ روپے چندہ سالانہ: -/۱۵۰ روپے۔

اسلامی فکر و تعلیم کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مضامین کا پیش کنندہ۔ نیوز اور ریویز کے زیر عنوان اہم اسلامی اخبارات و اطلاعات۔ "ایٹ لاسٹ" کے آخری عنوان کے تحت ایک سبق آموز واقعہ۔

ماہنامہ قلم قافلہ | مدیر اعلیٰ جناب گل بخشالوی (بہ تعاون مجلس ادارت و دیگر معاونین) پتہ: مقام کھاریاں، پوسٹ بکس نمبر ۲، ضلع گجرات - قیمت فی شمارہ: -/۵ روپے - سالانہ چندہ -/۵۰ روپے۔

گل بخشالوی صاحب کی ہمت ہے اور اردو زبان و ادب کی طاقت کہ کھاریاں جیسے مقام سے قلم قافلہ نامی رسالے نے صدیق سالک نمبر شائع کیا ہے۔ صدیق سالک (شہید) اردو ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل کر کے رخصت ہوئے۔ نہایت قابلِ داد ہے کہ گل صاحب نے ۳۴ تحریریں سالک صاحب کی شخصیت، ان کے فن اور ان کے متعلقین پر فراہم کر دی ہیں۔

کھاریاں کے قلم قافلے نے تو منزل مار لی۔

سچی باتیں (پمفلٹ) | از مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم و مغفور۔ ناشر: ڈاکٹر محمد یعقوب شاہ ہومیوپیتھ ۴ ۱۳۴/E حسنین آباد - لاہور کینٹ - قیمت نامعلوم۔

اصل میں عنوان لمبا ہے "سیرت نبوی کی روشنی میں سچی باتیں"۔ یہ سچی باتیں ۱۶ صفحے پر پھیلی ہوئی ہیں۔ صاحب صدق کا خاص طرزِ نگارش تو آپ کے علم میں ہوگا ہی - ان کی تحریریں پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

رسالہ تحریک | مرتب: جناب فیاض نقوی - پٹنہ؛ دفتر تحریک - ۵ شاہین منزل، راولاکوٹ آزاد کشمیر - سالانہ چندہ - ۳۰/- روپے

خود پاکستان بھی ایک پُراضطراب خطہ ہے۔ مگر مقبوضہ کشمیر میں چناروں کی آگ بھڑک رہی ہے اور آزاد کشمیر میں جذبوں کی آنچ سے پتھر تڑخ رہے ہیں۔ رسالہ تحریک آزاد کشمیر کے درد کا اظہار ہے۔

عظیم مسلمان مفکر، شاعر اور سائنسدان | از محمد اکرم قریشی ایم اے - ناشر: احیائے دین لائبریری سیالکوٹ - (تبلیغی سلسلہ)

اس پمفلٹ کا اصل موضوع تو علامہ اقبال ہیں۔ مگر ایک مضمون مسلمان سائنسدانوں کے متعلق عرفانہ تبسم کا بھی شامل ہے۔

تصحیح (شمارہ مئی ۱۹۸۹ء)

ص	۹	پر	قَالَ رَبِّ	کے بجائے	وَقُلْ رَبِّ
ص	۱۰	پر	لِيَسْئَلُ	〃	لِيَسْئَلَ
ص	۱۱	پر	فَلْيَسْتَعْفِفِ	〃	وَلْيَسْتَعْفِفِ
ص	۱۱	پر	النور ۲۳	〃	النور ۳۳
ص	۲۴	پر	وَمَا عَلَّمْنٰهُ	〃	وَمَا عَلَّمْنٰهُ

(شمارہ اپریل ۱۹۸۹ء)

ص ۳۵ پر الظَّمَاءُ کے بجائے الظَّمَأُ

رمضان المبارک کے قیمتی لمحات میں تزکیہ نفس کا بیش قیمت نادر ہدیہ

قرآن، رمضان اور محرم

از: سید اسعد گیلانی

- قرآن نے عظیم اسلامی انقلاب برپا کیا۔
- قرآن آج بھی انقلاب برپا کرنے کی قوت و توانائی رکھتا ہے۔
- قرآن مسلمانوں کا طاقتور ترین ہتھیار ہے جس سے وہ دنیا میں سب سے بڑی سپر پاور بن سکتے ہیں۔
- قرآن سے خوفزدگی تمام کافر حکومتوں میں موجود ہے اور وہ اس کی قوت سے خائف ہیں۔
- رمضان تزکیہ نفس اور روحانی توانائی میں اضافے کا مہینہ ہے۔
- رمضان میں ہی کفر و اسلام کا سب سے پہلا معرکہ بدر برپا ہوا تھا جس میں روزہ دار مجاہدین نے فتح پائی تھی۔
- قرآن اور رمضان مل کر مسلمانوں کو جہاد کا راستہ دکھاتے اور کامیاب کرتے ہیں۔
- محرم آزمائشوں کا مہینہ اور مسلمانوں میں صبر و قربانی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔
- ۳۰ کے لگ بھگ ریڈیائی تقاریر جامع اور بلیغ مبلغین اسلام کیلئے عمدہ تحفہ

ضخامت: ۱۹۲ صفحات ـ سائز: ۱۸×۲۳ ـ قیمت: ۲۱ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اردو بازار لاہور